MAKTABA AL - RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N.Y. 11230
TEL: (718) 258 - 3435

الرسالہ

Al-Risala

April 1996 • Issue 233 • Rs. 7

جتنی ہمت اتنا عمل اور جتنا عمل اتنی ہی کامیابی

یہ مختصر طور پر کامیاب زندگی کا فارمولا ہے۔

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

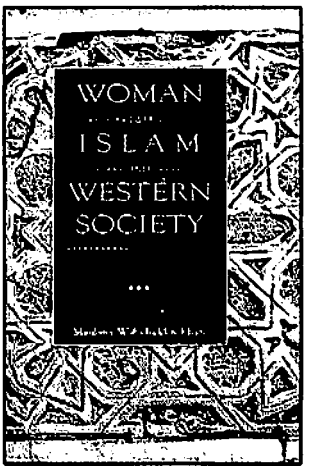

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

22 x 14.5 cm, 256 pages, ISBN 81-85063-75-3, Rs. 95

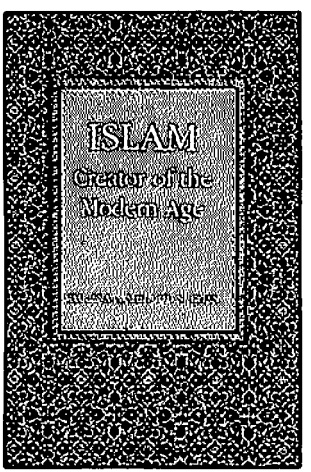

ISLAM: CREATOR OF THE MODERN AGE

By Maulana Wahiduddin Khan

Antiquity was an age of superstition: the present age is of science. Before reaching its present-day zenith, the modern, scientific age had to pass through three stages. The first was marked by the eradication of the superstitious mentality, the second saw the practical beginnings of scientific research; the third is the spectacular culmination of the scientific process in the second half of the twentieth century. The present volume examines the Islamic contribution to the completion of the first two stages during the millenium immediately followign upon the emergence of Islam.

22 x 14.5 cm, 125 pages, ISBN 81-85063-78-8, Rs. 65

MAKTABA AL - RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N.Y. 11230
TEL: (718) 258 - 3435

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۶، شمارہ ۲۲۳

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ
مسجد اور نماز	۴	حق کا اعتراف	۱۶
عبادت اور اخلاق	۵	قائد اتحاد	۱۸
حکومتی منصب	۶	جب زوال آتا ہے	۲۰
دعوتی عمل	۸	صبر و تحمل	۲۲
سکون کا راز	۹	ایک اسلامی حکم	۲۳
شکایت کے باوجود	۱۰	وقت کا استعمال	۲۴
ایک فرق	۱۱	حب شدید	۲۷
مظلوم کے لیے خوشخبری	۱۲	سفرنامہ یورپ — ۴	۲۸
حقیقت پسندی	۱۳	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۷
غلط فہمی	۱۴		

AL-RISALA (Urdu)
1. Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

مسجد اور نماز

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ مسجدوں پر فخر کریں گے مگر اس کو (ذکر و نماز سے) بہت کم آباد کریں گے (یأتی علی امتی زمان یتباهون بالمساجد ثم لا یعمرونها إلا قلیلا) فتح الباری ۱/۶۴۲

حضرت انسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں پر فخر کرنے لگیں (لا تقوم الساعة حتی یتباهی الناس فی المساجد) سنن ابی داؤد ۱/۱۲۰

اس طرح کی روایتیں دراصل دور زوال کے مظاہر کو بتاتی ہیں۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ روح ختم ہو جاتی ہے، اور ظاہری چیزوں کی دھوم بڑھ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں لوگ مسجدوں کی کثرت کا پُرجوش طور پر چرچا کرتے ہیں۔ وہ مسجد کی شاندار تعمیرات پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اپنی قومی عظمت کو مساجد کے در و دیوار میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں لوگ صرف ظاہر کو جانتے ہیں، اس لیے ان کے پاس عمارتی عظمت کے سوا کوئی اور عظمت نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے کو برتر محسوس کر سکیں۔

مگر جب لوگوں میں دین کی روح زندہ ہو تو ان کی نظر میں در و دیوار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ معمولی طور پر بنی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھ کر ان کو اور زیادہ سکون ملتا ہے۔ ان کو ایسی مسجدیں پسند آتی ہیں جہاں روشنیوں کا انتظام نہ ہو، کیوں کہ وہاں توجہ الی اللہ میں ان کے لیے کوئی چیز حارج نہیں ہوتی۔ نرم قالینوں پر سجدہ کرنے کے بجائے انھیں مٹی کے فرش پر اپنی پیشانی رکھنا زیادہ محبوب ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ان کے عاجزانہ سجدہ کے زیادہ حسب حال ہوتا ہے۔

در و دیوار کی عظمتیں ان لوگوں کے لیے خلل اندازی کا باعث ہونے لگتی ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی میں کچھ لمحات گزارنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اور ان کے رب کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو، اس لیے وہ سادہ مسجدوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں نہ کہ چمک دمک والی مسجدوں کو۔

عبادت اور اخلاق

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یشکر اللہ من لا یشکر الناس (سنن ابی داؤد ۴/۲۵۶) یعنی وہ آدمی جو انسان کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں الٰہیات اور انسانیات دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اسلام میں الٰہی عبادت کا تعلق بھی انسانی اخلاق سے جڑا ہوا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس آدمی کی نماز اس کے لیے وبال ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ لوگوں کو چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے میں بھی بخیل ہو (الماعون ۷) حدیث میں ہے کہ اس آدمی کا روزہ روزہ نہیں جو بظاہر روزہ رکھے مگر وہ قولی اور عملی جھوٹ کو نہ چھوڑے (صحیح البخاری) قرآن میں ہے کہ مومن اس طرح صدقہ دیتا ہے کہ وہ لینے والے سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری نہیں چاہتا (الدھر ۹) حج کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ حج میں نہ بیہودہ گوئی کرنا چاہیے اور نہ بے حکمی اور نہ لڑائی جھگڑا (البقرہ ۱۹۷)

عبادت اور اخلاق کا ایک دوسرے سے جڑا ہونا فطرت کا عین تقاضا ہے۔ انسان کا ہر عمل اس کی نفسیات کے تحت ہوتا ہے۔ اور نفسیات میں تقسیم ممکن نہیں۔ آدمی کے اندر اگر صحیح معنوں میں عبادت کی نفسیات پیدا ہو جائے تو اس کے بعد اخلاق کی نفسیات بھی ضرور اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ کسی کے اندر اگر خدا پرستی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر انسان دوستی بھی لازماً موجود ہوگی۔

عبادت کوئی رسمی اور وقتی چیز نہیں۔ عبادت ایک گہرا روحانی عمل ہے۔ جس آدمی کے اندر عبادت کی روح آجائے اس کی پوری شخصیت میں تواضع، احتیاط، خیر خواہی اور فضولیات سے پرہیز کا مزاج پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی کیفیات اخلاق کی اصل ہیں۔ یہ لطیف کیفیات جب سماجی تعلقات میں ظاہر ہوں تو اسی کا دوسرا نام انسانی اخلاق ہے۔

ایک عبادت گزار لازمی طور پر انسانی خدمت گار بھی ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق و عادات اور گفتار و کردار میں شرافت اور انسانیت کی روح بسی ہوئی ہوتی ہے۔

اگر ایک آدمی سچا خدا پرست ہو تو لازماً وہ سچا انسان دوست بھی ہوگا۔ یہ دونوں صفتیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔

حکومتی منصب

سفیان بن سعید بن مسروق الثوری ۹۷ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۶۱ھ میں بصرہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی کتابوں میں الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر بہت مشہور ہیں (الاعلام ۳/۱۰۴)

المسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں القعقاع بن حکیم کے حوالہ سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ المہدی کے پاس تھا۔ اس وقت سفیان الثوری وہاں لائے گئے۔ جب وہ آئے تو خلیفہ کو انھوں نے عام انداز کا سلام کیا، دربار خلافت والا سلام نہیں کیا۔

المھدی کا وزیر الربیع اس کے پاس تلوار پر ٹیک لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ المہدی نے سفیان ثوری کو دیکھ کر کہا کہ تم ہم سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم تمہارے اوپر قابو نہیں پاسکتے۔ مگر اب تم ہمارے اختیار میں ہو کیا تم اس سے نہیں ڈرتے کہ ہم تمہارے اوپر جو فیصلہ چاہیں کریں۔ سفیان ثوری نے کہا کہ اگر تم میرے معاملہ میں کوئی غلط فیصلہ کروگے تو قادر مطلق خدا تمہارے اوپر فیصلہ کرے گا اور وہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دے گا۔ وزیر ربیع نے کہا کہ اے امیر المومنین کیا اس جاہل کے لئے سزاوار ہے کہ وہ آپ سے اس طرح خطاب کرے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔

المہدی نے ربیع سے کہا کہ چپ رہو، تمہارا برا ہو۔ وہ اور اس قسم کے لوگ یہی تو چاہتے ہیں کہ ہم انھیں قتل کر دیں اور ان کو سعید ثابت کر کے اپنے کو شقی بنالیں۔ کاغذ لاؤ اور ان کے لئے لکھو کہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ وزیر ربیع نے اس کو لکھ کر انھیں دیدیا۔ سفیان ثوری کاغذ لے کر باہر نکلے۔ اس کو دجلہ میں پھینک دیا اور بھاگ گئے۔ اس کے بعد ان کو ہر شہر میں تلاش کیا گیا لیکن وہ نہیں ملے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔

سفیان الثوری نے جب کوفہ کے قاضی کا عہدہ قبول نہیں کیا تو اس کے بعد خلیفہ نے کوفہ کے ایک اور عالم کو یہ عہدہ دے دیا۔ ان کا نام شُریک بن عبد اللہ بن الحارث النخعی (۱۷۷) تھا۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو ایک عربی شاعر نے اس پر یہ شعر کہا کہ سفیان

بچ گئے اور اپنے دین کے ساتھ بھاگ گئے۔ اور شریک درہم کے پیچھے دوڑ پڑے:

تحرز سفیان وفرّ بدینہ　　　　وامسی شریك مرصداً للدراھم

شریک النخعی الکوفی بھی سفیان ثوری ہی کی طرح ایک بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ ان کے متعلق صاحب تذکرۃ الحفاظ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں میں نہایت عادل تھے (وکان عادلاً فی قضائہ) ان کے عادل ہونے کا ایک واقعاتی ثبوت یہ ہے کہ خلیفہ المنصور العباسی نے ان کو ۱۵۲ھ میں کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ مگر ان کے غیر مصالحانہ رویہ کی وجہ سے اس نے انھیں معزول کر دیا۔ اس کے بعد المہدی نے دوبارہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا۔ مگر اس کے بعد موسیٰ الہادی کو دوبارہ انھیں معزول کرنا پڑا۔ (الاعلام ۳/۱۶۳)

اس حقیقت کے باوجود شاعر نے مذکورہ شعر کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانہ میں تقویٰ کا ایک غلط معیار رائج ہو گیا۔ وہ یہ کہ جو شخص عہدہ قبول نہ کرے وہ متقی ہے اور جو شخص عہدہ قبول کر لے وہ غیر متقی۔ حالاں کہ اسلام میں اعمال کا مدار نیت پر ہے نہ کہ محض ظاہر پر۔ یہ سراسر ایک اضافی چیز ہے کہ کس نے حکومتی عہدہ قبول کیا اور کس نے قبول نہیں کیا۔ دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ عہدہ قبول کرنے کے بعد وہ اپنی نیت اور اپنے کردار کے اعتبار سے کیسا رہا۔

اہل علم اور اہل خیر کے لئے حکومتی عہدے قبول کرنا کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں۔ اس کی ایک انتہائی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ آپ خدا کے پیغمبر تھے اور آپ نے مصر کے مشرک بادشاہ کی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدہ قبول فرمایا۔ مگر بعد کے زمانہ میں علماء اسلام غیر ضروری طور پر حکومتی عہدوں کو برا سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہا گیا کہ یہ حضرت یوسف کے لئے خاص تھا۔ اب ہمارے لئے وہ جائز نہیں (ان ھذا کان لیوسف خاصۃ، وھذا الیوم غیر جائز) الجامع لاحکام القرآن ۹/۲۱۵

لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء کے لئے حکومتی عہدے قبول کرنا عین جائز ہے اور اس میں اسلام اور ملت کے لئے کثیر فائدے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ نیت خالص ہو اور کسی بھی قسم کا دنیوی مفاد مقصود نہ ہو۔ اسلام میں ساری اہمیت صرف نیت یا اسپرٹ کی ہے، ظاہر کی اہمیت تمام تر اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔

دعوتی عمل

یہ بات تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اسلام کا دعوتی عمل جاری رہنا ضروری ہے تاکہ اس کا پیغام ہر دور میں تمام نسلوں تک پہنچ سکے۔ یہ کام کیسے ہو۔ موجودہ زمانہ میں اس کے بارہ میں مختلف نقطۂ نظر ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام کے طور پر قائم و نافذ کیا جائے تاکہ لوگ اس کی برکتوں کا عملی تجربہ کریں۔ اس طرح وہ اسلام کے کمالات کے قائل ہو کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ دوسرے گروہ کا ذہن یہ ہے کہ ہر ہر مسلمان کے اندر اسلامی عمل اور اسلامی کردار پیدا کیا جائے۔ جب دوسری قومیں مسلمانوں کو چلتے پھرتے دیکھیں گی تو وہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیں گی۔

ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اشاعت اسلام کا عمل تو پچھلے ہزار سال کے دوران مسلسل جاری تھا، وہ صرف بیسویں صدی میں پہنچ کر منقطع ہوا ہے۔ حالانکہ ابتدائی مکی دور کے بعد پھر اس انداز کی دعوتی جدوجہد دوبارہ کبھی نہیں کی گئی۔ ایسی حالت میں اس کا سبب کیا تھا۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اب ایک محمود اور مستحکم اور محفوظ دین ہے۔ اس کی یہ حیثیت عالمی سطح پر بالفعل قائم ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس کے پھیلنے کے لیے اب نہ براہ راست تبلیغ کی شرط ہے اور نہ عملی نظام کی موجودگی یا اصلاح یافتہ مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اب وہ اپنے آپ لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا نہ پائی جائے۔

قدیم زمانہ میں کبھی نفرت کی فضا موجود نہ تھی۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں مسلسل اسلام کی اشاعت کا عمل جاری رہا۔ موجودہ زمانہ میں نااہل لیڈروں نے ساری دنیا میں یہ کیا کہ انھوں نے اسلام کے نام پر ٹکراؤ کی سیاست چلائی اور جدید میڈیا نے اس کو خوب مشتہر کیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا قائم ہو گئی۔ یہی نفرت کی فضا اسلام کے اشاعتی عمل کو جاری رکھنے میں رکاوٹ بن گئی۔

اسلام کے نام پر ٹکراؤ اور احتجاج کی سیاست نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے عمل کو روک دیا ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ اس لایعنی سیاست کو ترک کر دیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا، جیسا کہ وہ ماضی میں مسلسل اپنے آپ ہر جگہ جاری تھا۔

سکون کا راز

عن ابی هریرة ، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : انظروا الیٰ من اسفل منکم ولا تنظروا الیٰ من هو فوقکم فهو اجدر ان لا تزدروا نعمة الله علیکم (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۸/۹۷)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اس کو دیکھو جو تمہارے نیچے ہے اور اس کو نہ دیکھو جو تمہارے اوپر ہے۔ کیوں کہ اس رویہ سے اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ تم اپنے اوپر خدا کی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو۔

یہ زندگی کا ایک نہایت قیمتی اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں خود فطرت کے نظام کے تحت ایسا ہے کہ کسی کے پاس کم سامان ہوتا ہے اور کسی کے پاس زیادہ سامان۔ فرق کی یہ صورت حال کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ایسی حالت میں پرسکون زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنے اور دوسروں کے درمیان غلط تقابل نہ کرے۔

اگر وہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھے گا تو اس کے اندر حسد اور بے چینی پیدا ہوگی۔ وہ سکونِ قلب سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا اور اسی کے ساتھ اس کو روحانی سکون بھی حاصل ہوگا۔ اس کا دن چین کے ساتھ گزرے گا اور رات کے وقت اس کو اچھی نیند کی نعمت حاصل ہوگی۔

اس بات کو مشہور انگریز افسانہ نگار شیکسپیر (۱۶۱۶-۱۵۶۴) نے اپنے لفظوں میں اس طرح کہا ہے کہ یہ دراصل تقابل ہے جس کی وجہ سے لوگ پریشان رہتے ہیں :

It is by comparison that you suffer.

ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کا یہ نظام خود فطرت کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں گہری مصلحت ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان چیلنج کی صورت حال قائم رہتی ہے۔ یہی چیلنج تمام ترقیوں کا زینہ ہے۔ انسانی سماج میں اگر چیلنج ختم ہو جائے تو اس کی ترقیاتی سرگرمیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ آدمی کو چاہیے کہ جب وہ اپنے سے کم والے کو دیکھے تو شکر ادا کرے۔ اور جب اپنے سے اوپر والے کو دیکھے تو مسابقت کے جذبہ کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

شکایت کے باوجود

فتح مکہ کا واقعہ رمضان ۸ھ میں پیش آیا۔ اس کے جلد ہی بعد شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین ہوا۔ مکہ کی طرف اقدام سے کچھ ہی پہلے خالد بن الولید نے مدینہ آکر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مہموں میں حضرت خالد کو مسلم لشکر کا سردار بنا دیا۔

یہ بات انصار کے اوپر شاق تھی۔ کیوں کہ انصار کے لوگ بہت پہلے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایمان لاکر جاں نثاری کر رہے تھے۔ جب کہ حضرت خالد ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آج کل کی زبان میں یہ گویا سینیر کے اوپر جونیر کو ترجیح دینے کا معاملہ تھا۔ تاہم اس شکایت کے باوجود تمام انصار رسول اللہ کے ساتھ رہے، انھوں نے آپ کے ہر حکم کی اطاعت کی۔

خاتمۂ جنگ کے بعد عرب رواج کے مطابق شعراء نے اس کے بارہ میں اشعار کہے۔ انصار کے ایک شاعر عباس بن مرداس نے بھی اس موقع پر کچھ اشعار کہے۔ اس میں ایک طرف اس شکایت کا بھی تذکرہ تھا کہ آپ نے ہمارے اوپر خالد کو ترجیح دی اور ان کو قوم کے اوپر امیر بنادیا (فإن تك قد امّرت فی القوم خالداً) مگر اسی کے ساتھ شاعر نے کہا:

وقالَ نبیُّ المؤمنین تقدّمُوا　　فحُبِّبَ إلینا انْ نکونَ المُقدَّمَا

اور مسلمانوں کے نبی نے کہا کہ تم لوگ آگے بڑھو، تو ہمارے لیے یہ محبوب بن گیا کہ ہم آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے والے ہوں (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۱۱)

انصار کو اگرچہ ظاہر حالات کے مطابق شکایت تھی۔ مگر اس شکایت کو انھوں نے اپنے عمل پر اثر انداز ہونے نہیں دیا۔ شکایت کے باوجود وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ پوری طرح جڑے رہے۔ شکایت کے باوجود وہ اسلام کے محاذ پر متحدہ طاقت بن کر کھڑے ہو گئے۔

موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ باہم شکایتیں پیدا نہ ہوں۔ صحیح یا غلط اسباب کے تحت بہر حال ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے، حتیٰ کہ رسول اور اصحاب رسول سے بھی۔ مگر مومن شکایتوں سے بلند ہوتا ہے، وہ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرتا ہے۔ اسی لیے مومنین کی جماعت میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ شکایت اور اختلاف ان کے اتحاد کو درہم وبرہم کر دے۔

ایک فرق

۱۵ اگست ۱۹۹۵ کو دہلی میں ایک میٹنگ میں مسٹر راج موہن گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہاتما گاندھی کے پوتے ہیں اور اب ان کی عمر ۶۰ سال ہو چکی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ جاپان کی ایک کانفرنس میں شریک تھے۔ وہاں ایک جاپانی ڈیلی گیٹ نے ان سے کہا کہ میں پچھلے پندرہ سال سے مختلف مقامات پر ہونے والی کانفرنسوں میں شریک رہا ہوں۔ میں نے پایا کہ کسی انٹرنیشنل کانفرنس میں، جہاں جاپانی اور ہندستانی دونوں شرکت کر رہے ہوں، وہاں صدر کو ہمیشہ دو مشکل پیش آتی ہے۔ ایک، شرمیلے جاپانی کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ بولے۔ دوسرے، ہندستانی ڈیلی گیٹ کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ اپنی تقریر کو تمام کرے:

Chairperson of international seminars has two difficulties:
(1) To persuade the shy Japanese to speak.
(2) To persuade the Indian delegate to complete his speech.

ایک انسان وہ ہے جس کے مزاج میں سنجیدگی ہو۔ جو سیکھنا چاہتا ہو اور جس کے اندر کام کرنے کا شوق ہو۔ اس کا حال وہی ہوگا جو مذکورہ قول میں جاپانی کا حال بتایا گیا ہے۔ ایسا انسان بولنے سے زیادہ سننا چاہے گا۔ کیوں کہ سننا اس کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کا دھیان اپنی عملی ذمہ داریوں پر ہوگا۔ اور جس آدمی کا ذہن اپنی عملی ذمہ داریوں پر لگا ہوا ہو، اس کا بولنا کم ہو جاتا ہے۔ عمل کا مزاج اپنے آپ قول کو گھٹا دیتا ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو سنجیدگی سے خالی ہو۔ جس کے اندر یہ شوق نہ ہو کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔ جو محنت سے دور بھاگتا ہو۔ ایسے آدمی کا حال وہ ہوتا ہے جو مذکورہ قول میں ہندستانی کا بتایا گیا ہے۔ ایسا انسان سب سے زیادہ بولنے میں دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ کچھ اور باتیں ہیں جن کو اسے جاننا چاہئے۔ وہ بے تکان بولے گا، کیونکہ اس کا احساس ہوگا کہ زیادہ بول کر وہ اپنے کم کام کی تلافی کر سکتا ہے۔

زیادہ بولنا اور کم کرنا غیر سنجیدہ انسان کی علامت ہے، اور کم بولنا اور زیادہ کرنا سنجیدہ انسان کی علامت۔

مظلوم کے لیے خوش خبری

فورٹ وین جرنل گزٹ (Fort Wayne Journal-Gazette) امریکی ریاست انڈیانا کا ایک علاقائی اخبار ہے۔ اس نے ایک مقامی ریسٹوراں کے بارے میں ایک خبر چھاپی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ انسپکٹر نے ریسٹوراں کی جانچ کی تو اس نے اس کے ایک کمرے میں چوہے کی بیٹ (rat droppings) پائیں۔ اخبار کے ہیڈ لائن رائٹر نے اس خبر کی سرخی یہ لگا دی کہ جانچ کرنے والے نے ہوٹل میں چوہے پائے۔ یعنی ریسٹوراں میں صرف چوہے کی کچھ بیٹ ملی تھی مگر سرخی میں یہ لکھ دیا کہ ریسٹوراں میں زندہ چوہے پائے گئے۔

یہ ۱۹۹۲ کا واقعہ ہے۔ مذکورہ اخبار نے اگرچہ اگلے دن اس کی معذرت چھاپ دی تھی مگر ریسٹوراں کا مالک اس معاملہ کو عدالت میں لے گیا۔ اس نے عدالت سے کہا کہ اس غلط سرخی (inaccurate headline) کی وجہ سے میرے ہوٹل کی بدنامی ہوئی اور مجھے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ لمبی سماعت کے بعد عدالت نے ریسٹوراں کے دعوی کو قبول کرتے ہوئے اخبار کے اوپر تقریباً تین کرور روپیہ (985,000 $) کا جرمانہ عائد کیا جو اس کو ریسٹوراں کے مالک کو ادا کرنا ہوگا۔ (دی پائنیر ۲۴ جون ۱۹۹۴)

ہندستان جیسے ملکوں میں تو اس طرح کی زیادتیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ حال ہے کہ اگر ایک آدمی کسی کے خلاف ایسی زیادتی کر بیٹھے تو مظلوم آدمی خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ عدالت سے رجوع کرکے وہ اس کا بھرپور معاوضہ حاصل کرسکتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو اپنے عقیدہ کی رو سے اس وقت خوش ہونا چاہیے جب کہ کوئی شخص ان کے خلاف ظلم و زیادتی کا کوئی واقعہ کرے۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص کسی کو جانی و مالی نقصان پہنچائے، اس کی جائداد غصب کرلے، اس کے اوپر خلاف واقعہ الزام لگائے، اس کی کردار کشی کرے تو آخرت کی عدالت میں ظالم کو بلایا جائے گا اور اس کی نیکیاں اس سے لے کر مظلوم کو دے دی جائیں گی۔ اور اگر اس کے پاس نیکیوں کی مقدار کم ہو تو مظلوم کے گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ مظلوم ہلکا پھلکا ہوکر جنت میں جائے گا اور ظالم اپنے ساتھ دوسروں کے گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا جہنم میں داخل ہوگا۔

حقیقت پسندی

اگر آپ میدان میں ہوں اور بارش آجائے تو آپ بھاگ کر سایہ کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ یہ پسپائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ اسی طرح اگر زلزلہ آجائے تو آپ گھر سے نکل کر کھلے میدان میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی پسپائی نہیں ہے بلکہ ایک فطری حقیقت کا اعتراف ہے۔ جہاں انسان کا اور فطرت کا معاملہ ہو وہاں مسئلہ کا حل صرف اعتراف ہوتا ہے نہ کہ ٹکراؤ۔

بارش اور زلزلہ کا نظام جو خالق فطرت نے دنیا میں رکھ دیا ہے۔ انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچانے کی تدبیر کرے۔ اور اس کے نقصان سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اعراض کا اصول اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی زد سے ہٹا دیا جائے۔ اسی لیے آپ بارش کے وقت سایہ میں آجاتے ہیں اور زلزلہ کے وقت میدان میں۔

ٹھیک یہی معاملہ صبر اور اعراض کے اصول کا بھی ہے۔ صبر و اعراض کا رویہ کسی قسم کی بزدلی یا پسپائی نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر صرف حقیقت پسندی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ خالق فطرت نے انسان کو امتحان کی غرض سے آزادی عطا کی ہے۔ انسان اپنی آزادی کا استعمال کبھی صحیح کرتا ہے اور کبھی غلط۔ اب آپ کیا کریں۔ اگر آپ ہر انسان سے لڑنے لگیں تو لوگوں سے آپ ان کی آزادی چھین نہیں سکتے۔ کیوں کہ یہ آزادی ان کو خود مالک کائنات نے دے رکھی ہے، لوگوں کی آزادی چھیننے کی بے فائدہ کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ آپ اپنے راستہ کو کھوٹا کر لیں گے۔

ایسی حالت میں صرف ایک ہی ممکن رویہ ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو صبر کہا جاتا ہے یعنی لوگوں کی طرف سے اگر کبھی تلخی اور ناگواری پیش آجائے تو اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفر حیات جاری رکھا جائے۔

صبر و اعراض دوسروں کا مسئلہ نہیں، وہ خود اپنا مسئلہ ہے۔ بے صبری آدمی کے سفر کو روک دیتی ہے، اور صبر اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ آدمی کی زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

غلط فہمی

صحیح البخاری (کتاب النکاح، باب عرض الانسان ابنتہ او اختہ علی اھل الخیر) میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا جب ان کی صاحبزادی حفصہ بیوہ ہوگئیں جن کا نکاح خنیس بن حذافہ السہمی سے ہوا تھا۔ اور وہ مدینہ میں وفات پاگئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر میں عثمان بن عفان کے پاس آیا اور میں نے ان کو حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس پر غور کروں گا۔ چند دن کے بعد وہ مجھ سے ملے اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس وقت میں نکاح نہیں کرسکوں گا۔

حضرت عمر کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر صدیق سے ملا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی حفصہ کا نکاح آپ سے کردوں۔ ابوبکر خاموش رہے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا (فصمت ابوبکر فلم یرجع الیّ شیئاً)

حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابوبکر پر مجھے عثمان سے بھی زیادہ غصہ آیا (وکنت اوجدَ علیہ منی علی عثمان، وفی روایۃ: فغضب علیّ ابی بکر وقال فیھا، کنت اشدّ غضبا حین سکت منّی علی عثمان)

پھر میں کچھ دن تک ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا تو آپ کے ساتھ میں نے حفصہ کا نکاح کردیا۔ اس کے بعد میری ملاقات ابوبکر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ شاید تم مجھ پر غصہ ہوئے ہوگے جب کہ تم نے مجھ سے حفصہ کا پیغام دیا تھا۔ اور میں نے تم کو کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ اس معاملہ میں جو اب سے مجھے صرف اس چیز نے روکا تھا کہ میں جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا ذکر کیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں رسول اللہ کا راز کھول دوں۔ اگر آپ ان کو چھوڑ دیتے تو میں ضرور انھیں قبول کرلیتا (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۹/۸۱-۸۳)

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں انتہائی جلیل القدر صحابی ہیں۔ اس کے باوجود

ایسا ہوتا ہے کہ ایک صحابی دوسرے صحابی کے رویہ کو اتنا زیادہ غلط سمجھ لیتا ہے کہ اس پر اس کو غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ یہ در اصل غلط فہمی کا معاملہ تھا نہ کہ غلط کاری کا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمر ابتدائی مرحلہ میں مذکورہ واقعہ کو محض ظاہر کے اعتبار سے لے رہے تھے۔ ظاہر کے اعتبار انھیں دکھائی دیا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان نے نامناسب رویہ اختیار کیا۔ مگر جب معاملہ کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کا رویہ بالکل درست تھا۔ اس میں غصہ ہونے کی کوئی بات سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

ایک صحابی کو جب دوسرے صحابی کے معاملہ میں غلط فہمی ہو سکتی ہے تو عام مسلمان کو دوسرے مسلمان کے معاملہ میں بھی یقیناً غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنے میں وہ انتہائی محتاط ہو۔ عین ممکن ہے کہ بعض ظاہری چیزوں کو دیکھ کر وہ بری رائے قائم کر رہا ہو۔ حالاں کہ زیادہ گہرے اسباب بتا رہے ہوں کہ یہ سراسر غلط فہمی کی بات ہے، کیونکہ وہاں سرے سے کوئی غلط فعل پایا نہیں جا رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں باہمی تعلقات میں بگاڑ کا سبب اکثر حالات میں غلط فہمی ہوتا ہے۔ حتی کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظاہر حالات کے اعتبار سے غلط فہمی بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

یہ غلط فہمی دو مخلص افراد یا دو بے قصور گروہوں کے درمیان بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ جب بھی غلط فہمی کی صورت پیدا ہو تو ایسا نہ کرے کہ اس پر یقین کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ متعلق افراد سے مل کر اس کی تحقیق کرے۔ کامل تحقیق کے بغیر ہرگز وہ اس کو تسلیم نہ کرے۔ تحقیق کا طریقہ غلط فہمی سے پیدا ہونے والی برائیوں کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تحقیق کے بعد جب غلط فہمی بے بنیاد ثابت ہو تو فوراً اپنے دل و دماغ سے اس کو نکال دے۔ اپنے آپ کو دوبارہ اسی طرح معتدل بنا لے جس طرح وہ غلط فہمی کی صورت پیدا ہونے سے پہلے تھا۔

تحقیق کو اپنا اصول بنا لیجئے۔ اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔

حق کا اعتراف

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں عراق فتح ہوا۔ اس کے بعد یہ سوال تھا کہ دجلہ وفرات کے علاقہ کی زرخیز زمینیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آئی ہیں، ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ سابق رواج کے مطابق، فوجی سرداروں کی رائے یہ تھی کہ اس مفتوحہ زمین کا بڑا حصہ فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر کی رائے اس کے خلاف تھی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ زمین کو سرکاری بیت المال کے زیر تصرف رہنا چاہئے تاکہ آئندہ نسلوں تک اس کا فائدہ تمام لوگوں کو مل سکے۔

اس مسئلہ پر سخت اختلاف ہوا اور کئی دن تک بحث جاری رہی۔ خاص طور پر خالد بن الولید، عبدالرحمٰن بن عوف اور بلال بن رباح نے اتنی زیادہ حجت کی کہ حضرت عمر فاروق کی زبان سے یہ الفاظ نکل آئے کہ: اَللّٰھُمَّ اکفنی بلالاً۔ یعنی اے اللہ، تو مجھ کو بلال سے نجات دے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بنایا گیا جس میں حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت طلحہ جیسے لوگ تھے۔ اس کے باوجود اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔

کئی دن کی بحث کے بعد آخر کار حضرت عمر کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ (غنیمت میں) ان مفلس مہاجروں کے لئے حصہ ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے دارالاسلام میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں، اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو اُن کے بعد آئے (والذین جاؤا من بعدھم) الحشر ۸-۱۰

حضرت عمر فاروق نے لوگوں کو قرآن کی یہ آیت سنائی اور کہا کہ اس آیت میں غنیمت

اور فئی کا حکم بیان کرتے ہوئے والذین جاؤ امن بعدھم (اور جو ان کے بعد آئے) کا لفظ ہے۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فتوحات کے ذریعہ جو اموال ملیں وہ صرف حال کے لوگوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس میں آنے والی نسلوں کا بھی حق ہے۔ اگر ان مفتوحہ زمینوں کو میں موجودہ فاتحین کے درمیان بانٹ دوں تو ہماری آئندہ نسلوں کو اس میں حصہ نہیں مل سکے گا۔ اور یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہوگا۔ حضرت عمر کے اس استدلال کو تمام لوگوں نے مان لیا اور ایک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہی کی رائے درست ہے۔

اس کے بعد یہ اصول قائم ہوگیا کہ فتوحات کے ذریعہ جو زمینیں اسلامی مملکت میں داخل ہوں وہ حکومت اسلامی کی ملکیت قرار پائیں نہ یہ کہ فوج کے افراد میں تقسیم ہو کر ان کی انفرادی ملکیت میں چلی جائیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورہ حشر کی مذکورہ آیت نے لوگوں کے ہونٹ سی دئے اور اب ان کے لئے کچھ بولنے کا موقع باقی نہ رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں قبولیت حق کا مادہ تھا۔ ان کی بحث نہ سمجھنے کی وجہ سے تھی نہ کہ محض سرکشی کی بنا پر۔ اس لئے جب قرآن کی آیت نے حقیقت کھول دی تو اس کے بعد ان کے لئے سمجھنا کچھ دشوار نہ رہا۔

اس دنیا میں بولنے کی گنجائش اتنی زیادہ ہے کہ آدمی ہر دلیل کے جواب میں اس کے خلاف بولنے کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ پا لیتا ہے۔ اب جو لوگ غیر سنجیدہ ہیں وہ اسی طرح ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کر کے اسے رد کر دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ سنجیدہ ہوں اور اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوں۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات کسی بات کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر جب اس بات کو زیادہ واضح دلائل سے ثابت کر دیا جائے تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اصل بات کو ماننے میں کوئی الجھن پیش نہیں آتی۔

غلط کار وہ نہیں ہے جو غلطی کرے۔ غلط کار وہ ہے جو صحیح اور غلط واضح ہو جانے کے بعد بھی غلط روش پر قائم رہے۔ غلطی کسی بھی شخص سے ہو سکتی ہے۔ مگر جب دلیل سامنے آجائے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ غلط روش کو ترک کر کے صحیح روش کو اختیار کر لے۔ یہی مومن کا اور یہی سچے انسان کا طریقہ ہے۔

فوائد اتحاد

نبوت سے پہلے جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ابھی ۳۵ سال تھی، مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ یہ کعبہ کی تعمیر نو کا مسئلہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ کی جو تعمیر کی تھی، وہ زمانہ گزرنے کی وجہ سے بوسیدہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ قریش کو خیال ہوا کہ اس کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔

پہلا مسئلہ قدیم دیوار کو توڑنے کا تھا۔ اب تمام لوگ ڈر گئے۔ ہر ایک اس اندیشہ میں تھا کہ اگر اس نے اس مقدس عمارت پر پھاوڑا چلایا تو کہیں اس کے اوپر کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔ آخر کار ولید بن مغیرہ نے ہمت کی۔ وہ کعبہ کے سامنے پھاوڑا لے کر کھڑا ہوا اور کہا: اللّٰھم لم نزغ، اللّٰھم إنّا لا نرید إلّا الخیر (اے اللہ، ہم نے ٹیڑھی راہ اختیار نہیں کی۔ اے اللہ، ہم بھلائی کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔)

اس کے بعد سب نے مل کر دیوار توڑی۔ مگر قدیم بنیاد کو باقی رکھا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کھدائی میں ان کو ایک پتھر ملا۔ اس پر یہ کلمات لکھے ہوئے تھے:

مَنْ یَزْرَعْ خَیْرًا یَحْصِدْ غِبْطَةً۔ ومن یَزْرَعْ شَرًّا یَحْصِدْ نَدَامَةً۔ تعملون السیأت وتُجْزَوْن الحسنات۔ اجل، کما لا یُجْتَنَی مِنَ الشَّوْکِ العنب (سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۱۳)	جو آدمی نیکی بوئے گا وہ قابل رشک فصل کاٹے گا۔ اور جو آدمی برائی بوئے گا وہ ندامت کی فصل کاٹے گا۔ کیا تم لوگ برائی کروگے اور اچھا بدلہ پاؤگے۔ ایسا نہیں ہوسکتا، جس طرح کانٹے کے پیڑ سے انگور نہیں توڑے جاسکتے۔

قریش کے ہر قبیلہ نے کعبہ کی تعمیر نو کے لئے پتھر جمع کئے۔ پھر اس کی تعمیر شروع کی۔ جب تعمیر اس مقام پر پہنچی جہاں حجر اسود کو دوبارہ لاکر نصب کرنا تھا تو قبائل کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ یہ ایک شرف کی بات تھی، چنانچہ ہر قبیلہ یہ چاہنے لگا کہ وہی حجر اسود کو اٹھائے اور وہی اس کو اس کے سابقہ مقام پر لاکر رکھے۔ اختلاف بڑھا۔ لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہوگئے۔ یہاں تک کہ بنو عبد الدار خون سے بھرا ہوا ایک کٹورا لائے اور اس میں اپنی انگلیاں ڈال کر آخر وقت تک لڑائی کرنے کا عہد کیا۔

اسی تکرار میں چار یا پانچ دن گزر گئے۔ آخر ان کو ہوش آیا۔ سب کے سب مسجد کے اندر اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور انصاف پر راضی ہو گئے (ثم انھم اجتمعوا فی المسجد وتشاوروا وتناصفوا) صفحہ ۲۱۳)

ابوامیہ بن المغیرہ اس وقت قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔ اس نے کہا کہ اے قریش کے لوگو، تم لوگ اپنے اختلاف کا فیصلہ اس طرح کرو کہ کل صبح کو جو پہلا آدمی مسجد کے دروازہ سے داخل ہو اس سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرالو۔ سب نے یہ رائے مان لی۔

اگلے دن جو شخص سب سے پہلے مسجد میں داخل ہوا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے جب آپ کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو الامین ہیں۔ ہم ان پر راضی ہیں، یہ تو محمد ہیں (ھٰذا الامین، رضینا، ھٰذا محمد) اس کے بعد لوگوں نے اپنا مسئلہ آپ کے سامنے رکھا۔ آپ نے فرمایا کہ تم ایک کپڑا لاؤ۔ چنانچہ کپڑا لاکر آپ کو دیا گیا۔ آپ نے کپڑے کو زمین پر پھیلایا اور پھر حجر اسود کو اٹھا کر اس کپڑے پر رکھ دیا۔ آپ نے کہا کہ اب ہر قبیلہ اس کا ایک ایک کونا پکڑلے پھر سب مل کر ایک ساتھ اس کو اٹھائیں۔

انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب وہ اس کو لے کر اصل مقام پر پہنچے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں وہاں رکھ دیا جہاں اس کو نصب کرنا تھا۔ اس کے بعد کعبہ کی تعمیر مکمل کی گئی۔ اختلاف اور لڑائی کا معاملہ پر امن طور پر حل ہو گیا۔

اس واقعہ سے اتحاد کے دو اصول ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ قائد جو مرکز اتحاد کے طور پر کام کرے، اس کو اخلاقی اعتبار سے لوگوں کا معتمد علیہ ہونا چاہئے۔ لوگ اس کو سچے اور امانت دار کی نگاہ سے دیکھیں۔ لوگ اس کو اپنے سے کچھ اوپر محسوس کریں۔ جب تک ایسا ایک شخص درمیان میں نہ ہو، لوگوں کے درمیان اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ قائد اتحاد دوسروں کا لحاظ کرنے والا ہو۔ ثمرۂ اتحاد میں وہ تمام لوگوں کو حصہ دار بنائے۔ اتحادی عمل میں وہ ہر ایک کو شریک کرے۔ کامیاب قائد دوسروں کے درمیان انھیں کی طرح رہتا ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا سلوک کرتا ہے۔ اس کے دل میں ہر ایک کے لئے خیر خواہی ہوتی ہے۔ وہ قائد ہو کر بھی اپنے آپ کو دوسروں کے برابر رکھتا ہے۔ یہی سچا قائد ہے۔

جب زوال آتا ہے

قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (الحدید ۱۶)

امت پر جب وہ لمحہ آتا ہے کہ طول امد کے نتیجہ میں اس کے افراد کے اندر قساوت اور بے حسی پیدا ہو جائے، تو اس وقت ایسا نہیں ہوتا کہ دین کا نام و نشان بالکل مٹ گیا ہو۔ اس وقت جو خرابی پیش آتی ہے وہ یہ کہ دین کے ظواہر تو باقی رہیں مگر دین کی روح کا خاتمہ ہو جائے۔

جب یہ حالت آتی ہے تو لوگوں کے درمیان دین کی دھوم خوب دکھائی دیتی ہے، مگر دین کی اندرونی اسپرٹ کہیں موجود نہیں ہوتی۔ پھل کا چھلکا باقی رہتا ہے مگر اس کا مغز باقی نہیں رہتا۔ حدیث میں اس حالت کے بارہ میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ بل انتم کغثاء (بلکہ تم جھاگ کی مانند ہو گے) سیلاب کا جھاگ بظاہر بہت نمایاں ہوتا ہے، مگر اس کے اندر سیلاب والی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

جب کوئی گروہ اس نوبت کو پہنچتا ہے تو اس کے افراد میں ایمان بس تلفظ کلمہ کی سطح پر ہوتا ہے، مگر معرفت کی سطح پر وہ کلمہ کی حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ذکر کی تکرار تو ہوتی ہے مگر خدا کی سچی یاد ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ وہ قرآن کو تلاوت کی کتاب کی حیثیت سے تو جانتے ہیں مگر وہ اس قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں جو دلوں کو تڑپائے اور آنکھوں کو اشک بار کر دے۔ وہ انسانوں کی بڑائی میں گم ہوتے ہیں مگر خدا کی بڑائی میں جینا انھیں نصیب نہیں ہوتا۔

وہ اپنے نعروں کے ذریعہ نفس کو مرتعش کر دیتے ہیں مگر وہ اس تقویٰ سے ناآشنا ہوتے ہیں جو ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ جذباتی تقریریں سن کر مجمع عام میں انھیں روتے دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اس گریہ کو نہیں جانتے جس کے بارہ میں حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ: رجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ (آدمی نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہہ پڑیں)

ایسے لوگ اسلامی قانون نافذ کرو کے ہنگامے برپا کرتے ہیں مگر ان کا سینہ خضوع اور تواضع کی کیفیت سے خالی ہوتا ہے۔ وہ دعوت کے نام پر سرگرمیاں دکھاتے ہیں مگر انسانوں سے محبت کرنا کیا ہے، اس کو وہ نہیں جانتے۔ وہ قوموں کے خلاف جہاد چھیڑتے ہیں مگر قوموں کے لئے شفقت سے ان کا اندرون بالکل خالی ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر گن کلچر کو فروغ دیتے ہیں، حالاں کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رحمت کلچر کو فروغ دیا جائے۔

ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کسی کے اوپر تنقید کرتے ہیں تو عیب جوئی اور الزام پر اتر آتے ہیں۔ ان پر کسی کا حق آتا ہو تو وہ حق کی ادائگی کے لئے حساس نہیں ہوتے۔ کسی سے ان کا اختلاف ہو جائے تو فوراً وہ اس کے معاملہ میں بے انصافی پر اتر آتے ہیں۔ وہ اپنے حزب کی حمایت کو جانتے ہیں۔ مگر وہ حق کی حمایت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے کرتے نہیں۔ اور جو کچھ کرتے ہیں اس کو بولتے نہیں۔ ان کی غلطی کو خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے مگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بے ضرر دینداری ان کو بہت پسند ہوتی ہے۔ مگر جس دین سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہو اس دین سے انھیں دل چسپی نہیں ہوتی۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو اسلام کا چمپین سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے کام کا کریڈٹ لینے کے لئے بے تاب رہتے ہیں جس کو انھوں نے انجام نہیں دیا۔ اسلام کو داخلی طور پر اپنانے کی انھیں زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ مگر خارجی دنیا میں اسلام کا نمائندہ بننا انھیں بہت مرغوب ہوتا ہے۔

القرطبی نے سورہ حدید کی مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے کہ فضیل بن عیاض ایک غلط کام کی طرف مائل ہو گئے۔ اس وقت کسی نے یہ آیت پڑھ دی: الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (الحدید ۱۶) وہ فوراً اس کام سے رک گئے اور کہا کہ بلی و اللہ قد آن (ہاں اے اللہ، اس کا وقت آگیا) جلد ۱۷، صفحہ ۲۵۱

یہی مومن کا مزاج ہے۔ مومن پر کبھی غفلت طاری ہوتی ہے اور وہ غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا احساس اس قدر زندہ ہوتا ہے کہ جب اس کو توجہ دلائی جاتی ہے تو وہ فوراً پلٹ آتا ہے۔ مومن غلطی سے توبہ کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ غلطی میں پڑا رہنے والا۔

وقت کا استعمال

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے (افضل العبادۃ انتظار الفرج) یہ ایک حکیمانہ بات ہے جو خدا کے پیغمبر نے ہمیں بتائی۔ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے الجھے ہوئے معاملات میں اکثر کسی مسئلہ کا سادہ حل یہ ہوتا ہے کہ اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔

خدا نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں سارے اسباب ہمیشہ اصلاح اور تعمیر کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ راستہ میں کوئی گندگی ڈال دیں تو فوراً لاکھوں کی تعداد میں بیکٹیریا وہاں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ اس کو تحلیل (decompose) کرکے اس کو مفید گیس میں تبدیل کر سکیں۔ یہی فطرت کے پورے نظام کا حال ہے۔ اس لئے انتظار کی پالیسی اس دنیا میں کوئی بے عملی کی پالیسی نہیں۔ وہ عین عمل کی پالیسی ہے کیوں کہ انسان کا انتظار کرنا گویا فطرت کو یہ موقع دینا ہے کہ وہ حرکت میں آکر اس کے مسئلہ کو زیادہ بہتر طور پر حل کر دے۔ اسی بات کو شاعر نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک بار میں ایک بڑے شہر میں گیا۔ وہاں میری ملاقات ایک تاجر سے ہوئی۔ وہ سخت پریشان تھے۔ حتی کہ ان کا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک تجارتی سامان تیار کیا۔ مگر جب وہ اس کو مارکیٹ میں لائے تو انھیں بروقت خریدار نہ مل سکے۔ ان کا سامان گودام میں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کوئی دعا یا عمل بتائیے جس سے میں اس تجارتی بحران سے نکل سکوں۔

میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ایک نصیحت لکھی اور اس کاغذ کو ایک لفافہ میں بند کرکے انھیں دے دیا۔ میں نے کہا کہ اس لفافہ کو آپ دس دن کے بعد کھولئے گا۔ اس لفافہ کے اندر جو کاغذ بند تھا اس پر میں نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں ایک مختصر جملہ ان الفاظ میں لکھا تھا: اپنے معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

ڈیڑھ سال کے بعد مذکورہ تاجر کی طرف سے ایک خط میرے پاس آیا۔ اس میں انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ کے مشورہ کے مطابق میں نے انتظار کی پالیسی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ اللہ کے فضل سے میرا سارا مال نفع کے ساتھ فروخت ہو گیا۔ میرا پھنسا ہوا روپیہ خالی ہو گیا ہے اور اب میں ایک نیا کاروبار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ اخلاقی عمل کا عظیم قانون خدا کے بعد یہ ہے کہ وقت کا احترام کیا جائے :

The great rule of moral conduct is, next to God, to respect time.

خدا کا حق انسان پر یہ ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرے۔ خدا سب سے بڑا ہے۔ وہ انسان کا خالق اور مالک ہے۔ وہی سب کچھ دینے والا ہے۔ اس لئے وہی اس کا حقدار ہے کہ سب سے زیادہ اس کی تعظیم کی جائے۔ اسی کا نام پرستش یا عبادت ہے۔

وقت موجودہ دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں سب کا سب وقت کے دائرہ میں کرتے ہیں۔ جہاں وقت ختم ہو جائے وہاں انسان کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اس لئے انسان کو سب سے زیادہ وقت کا پاس و لحاظ کرنا چاہئے۔ وقت کو ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس جو سب سے بڑی دولت تھی اس کو اس نے ضائع کر دیا۔ وقت کو اگر آپ استعمال نہ کریں تو وہ آپ کے پاس ٹھہرا نہیں رہے گا بلکہ چلا جائے گا۔ اور پھر کبھی لوٹ کر آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ وقت کا جو لمحہ کھویا گیا وہ ابدی طور پر کھویا گیا۔ اسی کو شاعر نے سادہ طور پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

شیکسپیئر جو مشہور انگریزی ادیب اور شاعر ہے، اس کا ایک قول یہ ہے کہ — میں نے وقت کو برباد کیا تھا اب وقت مجھ کو برباد کر رہا ہے :

I wasted time and now doth time waste me.

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو وقت مجھے ملا تھا وہ میرے لئے عمل کا یا ترقی کی طرف بڑھنے کا ایک لمحہ تھا۔ جب میں نے اس ملے ہوئے وقت کو استعمال نہیں کیا تو اس کے بعد یہ ہوا کہ میں ترقی کی طرف اپنا

سفر بھی جاری نہ کرسکا جس کا نتیجہ ابدی محرومی تھا۔ اس طرح اب میں محرومی کی صورت میں اپنے ضیاع وقت کی قیمت ادا کر رہا ہوں۔

گول برن (Goulburn) کا ایک قول اس قابل ہے کہ ہر آدمی اس کو یاد کرلے۔ وہ اس کو اس طرح محفوظ کرلے کہ وہ ہمیشہ اس کے دماغ میں مستحضر رہے۔ وہ قول یہ ہے کہ زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جس کے ضائع کرنے کا ہم تحمل کرسکیں:

There is not a single moment in life that we can afford to lose.

وقت کو کھونا عمل کے مواقع کو کھونا ہے۔ جس نے عمل کے مواقع کو کھو دیا اس نے گویا کہ اپنا سب کچھ کھو دیا۔ وقت کو کھونے کے بعد کوئی بھی چیز باقی نہیں رہتی جس کو پانے کے لئے کوئی شخص جد و جہد کرے۔

وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے زندگی میں انضباط (ڈسپلن) پیدا کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کی چند ضروری تدبیریں یہ ہیں۔

۱۔ صبح کو سویرے اٹھنا۔ رات آرام کرنے کے لیے ہے اور دن کام کرنے کے لئے۔ آدمی جتنا زیادہ سویرے اٹھے گا اتنا ہی زیادہ وہ اپنے دن کو مفید طور پر استعمال کرسکے گا۔ اگر آپ اپنے ملے ہوئے وقت کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو صبح کو سویرے اٹھنے کی عادت ڈالئے۔

۲۔ اپنا احتساب کرنا۔ شام کو جب آپ سونے کے لئے بستر پر لیٹتے ہیں تو یہ سوچئے کہ آج کا دن آپ نے کیسا گزارا۔ آپ نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ کون سا کام آپ کا صحیح تھا اور کون سا کام غلط۔ اپنے آج کے دن کو آپ اور زیادہ بہتر کس طرح بنا سکتے تھے۔ حال کا یہ احتساب آپ کے مستقبل کو زیادہ بہتر بنانے میں مدد کرے گا۔

۳۔ ڈائری کا استعمال۔ ہمیشہ اپنے پاس ایک پاکٹ ڈائری رکھئے۔ اس میں ہر روز کے مشاہدات اور تجربات کو مختصر طور پر لکھتے رہئے۔ یہ ڈائری آپ کے لئے نہ صرف ایک یادداشت ہوگی بلکہ وہ آپ کے لئے ایک ریگولیٹر بھی بن جائے گی۔ وہ آپ کی زندگی کی بہترین گائڈ ثابت ہوگی۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو نشر کیا گیا۔

حبِّ شدید

محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جائز حدود میں آدمی کسی بھی چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ مگر حبِّ شدید صرف ایک اللہ سے ہونا چاہیے۔ صرف اللہ کو یہ حق ہے کہ انسان اپنے جذباتِ محبت کو سب سے زیادہ اس سے وابستہ کرے، اس کی قلبی شیفتگی کا سب سے بڑا مرجع خداوند ذوالجلال ہو۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (البقرہ ۱۶۵)

اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہیے۔

غیر اللہ کے ساتھ حبِّ شدید کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً پتھر کے بتوں کے ساتھ بڑھا ہوا قلبی لگاؤ۔ اپنے اکابر سے بہت زیادہ عقیدت، قوم کے ساتھ غیر معمولی محبت، وغیرہ۔ آدمی کو جس چیز سے حبِّ شدید ہو اسی کی یاد میں وہ جینے لگتا ہے، اسی کا تذکرہ اس کے لیے سب سے زیادہ محبوب بن جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری چیزیں رسمی تعلق کے خانہ میں چلی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ان کے اندر اللہ کے لیے حبِّ شدید نہیں۔ ذاتی مفاد، سیاسی اقتدار، قومی عزت، تاریخی عظمت، اس قسم کی چیزیں ان کے لیے حبِّ شدید کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ خدا ان کے حبِّ شدید کا موضوع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ قسم کی چیزوں پر ان کے درمیان بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ مگر محبتِ خداوندی کی بنیاد پر کوئی تحریک ان کے درمیان نہیں اٹھی۔

موجودہ زمانہ میں جو علوم انسانی ظاہر ہوئے ان میں خدا کے وجود کو یکسر حذف کر دیا گیا مگر مسلم دنیا میں کوئی بھی شخص نظر نہیں آتا جو اس پر تڑپے اور علوم جدیدہ سے واقفیت حاصل کرکے خدا کے وجود کو علمی حیثیت سے ثابت شدہ بنانے کے لیے محنت کرے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اقوام عالم کے اوپر خدا کے دین کی شہادت دی جائے۔ اگر ساری مسلم دنیا میں کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں جو اس کے لیے بے چین ہو اور عملِ شہادت کو جاری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

یکم اکتوبر کو پہلی بار برطانی اخبارات میں انڈیا کے بارہ میں نمایاں خبر پڑھی۔ یہ بھونچال کی خبر تھی۔ مہاراشٹر کے اضلاع لاتور اور عثمان آباد میں شدید بھونچال کے نتیجہ میں ۲۰ دیہات میں زبردست تباہی آئی۔ چھ دیہات کا وجود مٹ گیا۔ تقریباً ۳۰ ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

زلزلہ کا سبب زمین کی قدرتی بناوٹ ہے۔ زمین اوپر سے بظاہر ٹھوس دکھائی دیتی ہے مگر اس کے نیچے بہت بڑی مقدار میں پگھلا ہوا مادہ ہے۔ زمین کی پرت پلیٹوں کی مانند اندر کی نرم تہ پر پھسلتی رہتی ہے۔ جب یہ پلیٹیں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں تو زمین میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ اس وقت زمین کی تہوں کے سرکنے سے زلزلہ آتا ہے۔

زلزلہ کی تباہی سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ جو کچھ ممکن ہے وہ صرف یہ کہ مکانات کی تعمیر اس طرح لچکدار انداز میں کی جائے جو زلزلہ کے جھٹکے کو سہار سکے۔ اور ہل کر اپنی جگہ کھڑی رہے جس طرح آندھی کے مقابلہ میں گھاس کرتی ہے۔ کیلی فورنیا (امریکہ) میں زلزلے عام ہیں۔ مگر اسی طرز تعمیر کی بنا پر آجکل وہاں جانی نقصان بہت کم ہوتا ہے۔ زلزلوں کا شکار اب زیادہ تر وہ قومیں ہوتی ہیں جہاں منصوبہ بند تعمیر کا فقدان ہے۔

محمود صاحب ایک پاکستانی میکانیکل انجنیئر ہیں۔ وہ ٹریننگ کے تحت تین سال کے لئے اوساکا (جاپان) میں رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک کارخانہ میں وہ تربیت کے لئے جاتے تھے۔ وہاں وہ دیکھتے تھے کہ روزانہ ایک بوڑھا آدمی آتا ہے۔ وہ خالی بیگ سمیٹ کر جمع کرتا ہے اور ان کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی لوئر گریڈ کا ملازم ہے جو اسی کام کے لئے مقرر ہے۔ اس کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ انھیں کسی ضرورت سے کارخانہ کے چیف انجنیئر کے یہاں جانا پڑا۔ انھوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی چیف انجنیئر کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے جس کو وہ کارخانہ میں صفائی کرتے دیکھا کرتے تھے۔ محمود صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں جب آفس آتا ہوں تو لوگوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میرے پاس وقت رہتا ہے۔ اس وقت کارخانہ چلا جاتا ہوں اور وہاں لوگوں کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ اس کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ مجھے ہر چیز کی فرسٹ ہینڈ معلومات ہو جاتی ہے جو بحیثیت چیف انجنیئر مجھے اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں کام آتی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار کارخانہ کے ورکروں نے ہڑتال کر دی۔ چھ گھنٹہ تک جاری رہنے کے بعد ہڑتال ختم ہوگئی۔ اگلے دن وہ کارخانہ آئے تو انھوں نے دیکھا کہ لنچ کے وقت ورکروں نے چھٹی نہیں کی۔ وہ لگاتار کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ورکر سے پوچھا کہ آج تم لوگوں نے لنچ کا وقفہ کیوں نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ کل کی ہڑتال کی کمی پوری کرنے کے لئے۔ محمود صاحب نے کہا کہ اس ہڑتال میں تو مینجمنٹ کی غلطی تھی۔ ورکر نے کہا کہ غلطی جس کی بھی ہو جب کام کم ہوگا تو نیشنل آوٹ پٹ کم ہوگا۔ اور پھر پوری قوم کو اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔

یکم اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد برمنگھم کی مسلم خواتین کا اجتماع تھا۔ اس اجتماع کا انتظام جناب شمشاد خاں صاحب کے مکان پر کیا گیا تھا۔ خواتین مکان کے ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوگئیں۔ ایک اور کمرہ میں مائک کا انتظام تھا۔ یہاں سے میں نے مائک پر اپنی تقریر کی۔ کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔

میں نے کہا کہ اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے عورت کا درجہ گھٹایا ہے۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ میں نے کہا کہ ایک چیز ہے عورت کا احترام اور اس کے حقوق۔ دوسری چیز ہے ورک پلیس کا مسئلہ۔ اسلام میں عورت اتنی ہی محترم اور معزز ہے جتنا کہ مرد۔ البتہ ورک پلیس کے معاملہ میں دونوں میں فرق کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ دونوں کا حیاتیاتی فرق ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مغرب میں کہا جاتا ہے کہ (Ladies first) مگر اس اصول کو اسلام میں زیادہ بڑے پیمانے پر قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلمان جو حج کے لئے مکہ جاتے ہیں وہاں وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ یہ ایک خاتون کے نقش قدم کی پیروی ہے جن کا نام ہاجرہ تھا۔

حضرت ہاجرہ کو یہ عظیم مرتبہ کیوں ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک نئی نسل بنانے کے لئے قربانی دی تھی۔ وہ اس مقولہ کی بہترین مثال تھیں کہ :

There is a woman at the beginning of all great things.

میں نے کہا کہ آج مسلم خواتین کو حضرت ہاجرہ کے اسی رول کو دہرانا ہے۔ انھیں دوبارہ اپنے بچوں کو تربیت دے کر ایک نئی نسل تیار کرنی ہے جو دور جدید میں اسلام کی عظمت قائم کر سکے۔

۲ اکتوبر کی دوپہر کو یہاں احمد دیدات صاحب کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا۔ اس سے پہلے عرب امارات میں ایک بار ان کی تقریر سن چکا ہوں۔ آج جو کیسٹ دیکھا وہ لندن کے ایلبرٹ ہال کی تقریر تھی۔ اس کا عنوان تھا:

How Rushdie fooled the West.

اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ سلمان رشدی نے اپنی کتاب شیطانی آیات میں صرف اسلام کے ساتھ بے ہودگی نہیں کی ہے بلکہ خود مغرب کے ساتھ بھی بے ہودگی کی ہے جس نے اس کو انعام دیا اور جو اس کو پناہ دئے ہوئے ہیں۔ دیدات صاحب نے کہا کہ آپ خود کیوں اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ آپ تو مغرب کو رشدی کے سیاہ کارنامے بتائیے اور پھر ان کو اس سے نمٹنے دیجئے:

and let them do the job

مجھے یہ بات پسند آئی۔ ایک ایسا مسئلہ جو دوسروں کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حل کیا جا سکتا ہو اس کو اپنے ہاتھ میں لینا کوئی عقلمندی نہیں۔ اس قسم کا غیر ضروری فعل وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سوچے بغیر کوئی کام کریں۔ جن کے اعمال کا سرچشمہ ان کے جذبات ہوں نہ کہ ان کی عقل۔

عبد اللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جو سعودی عرب کی طرف سے بہت بڑی تعداد میں چھاپ کر پھیلایا گیا ہے۔ اس میں بہت سے اجزاء حذف کر دئے گئے ہیں۔ برمنگھم میں مجھ کو ابتدائی نسخہ ملا۔ اس کو میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ مجھے اس کے تفسیری حواشی بہت پسند ہیں۔

اس میں عبد اللہ یوسف علی کا ابتدائی دیباچہ (preface) شامل ہے۔ اس پر ۴ اپریل ۱۹۳۴ کی تاریخ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ اور تفسیر ان کے چالیس سالہ مطالعہ اور تفکیر کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے نہایت سخت حالات میں اس کو لندن میں مکمل کیا اور آنسوؤں کے ساتھ اس کو لکھا۔ چنانچہ دیباچہ میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کے مسودات آنسوؤں سے سینچے گئے:

...watered by tears.

اس دیباچہ میں انھوں نے قرآن کی بابت کئی باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن ہماری روحانی آنکھوں کو کھولتا ہے:

The Qur'an opens our spiritual eyes.

یہ قرآن کی نہایت عمدہ تشریح ہے۔ قرآن کا اصل مقصد انسان کی روحانی بصیرت کو زندہ کرنا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے جس کی روحانی بصیرت زندہ ہو جائے وہی دراصل قرآن کا قاری ہے۔

۲ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد برمنگھم کے مسلم کمیونٹی سنٹر اور جمعیۃ اہل حدیث مرکز (Green Lane) میں خطاب کا پروگرام تھا۔ میں نے کہا کہ سلطان ٹیپو ۱۷۹۹ میں انگریزوں سے لڑکر شہید ہو گئے۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان ساری دنیا میں اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اس دو سو سالہ جنگ نے مسلمانوں کو تباہی کے سوا کچھ اور نہیں دیا۔

مسلمان آخر اس بے فائدہ لڑائی میں کیوں مشغول ہیں۔ اس کی وجہ ہمارے رہنماؤں کی ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے لئے دو ہی ممکن صورت ہے۔ سلطان ٹیپو کے الفاظ میں، یا تو شیر کی طرح لڑ کر مر جانا یا گیدڑ بن کر رہنا۔ دوسرے لفظوں میں جنگ یا بزدلی۔ چوں کہ بزدل بن کر رہنا انھیں پسند نہیں، اس لئے وہ بہادری کی موت مر رہے ہیں۔

مسلم رہنماؤں کو معلوم نہیں کہ یہاں ایک تیسرا انتخاب بھی ہے۔ اور وہ ہے ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے تیاری کرنا۔ مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے امکانات کو استعمال کرنا۔ یہ گویا 'تھرڈ آپشن ہے' اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی بتاتی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آپ نے ہمیشہ اسی تھرڈ آپشن کو اختیار کیا ہے۔

تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ کا طریقہ جنگ کا طریقہ نہیں تھا۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بار بار لڑوں اور بار بار شہید کیا جاؤں۔ میں نے کہا کہ مطالعہ کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ رسول اللہ کو بار بار شہید ہونے کا موقع ملا۔ پھر کیوں آپ نے اس سے اعراض کیا۔ ابتدائی دور میں آپ مکہ

میں نماز باجماعت قائم کرتے تو وہ لوگ آپ کے قتل کے درپے ہو جاتے۔ کمزور مسلمانوں کو ستایا جا رہا تھا۔ اگر آپ اس میں عملی مداخلت کرتے تو وہ آپ کے ساتھ وہی کرتے جو انھوں نے آل یاسر کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ہجرت، حدیبیہ، خندق، وغیرہ میں لڑ کر شہید ہونے کے مواقع آئے، مگر کبھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جب تک دونوں پہلوؤں کو نہ دیکھا جائے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

مدرسہ قاسم العلوم (Washwood Heath Road) کی دعوت پر ۳ اکتوبر کی صبح کو وہاں جانا ہوا۔ وہاں اہل علم کی ایک مجلس کی صورت میں بات چیت ہوئی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک کام کا تعلق ہے وہ تو عملاً جاری ہے۔ ہمارے یہاں ادارے قائم ہیں۔ بہت سی بڑی بڑی جماعتیں سرگرم ہیں۔ برطانیہ میں ایک ہزار مسجدیں ہیں جو اسلامی سنٹر کے طور پر چل رہی ہیں۔ مگر ان سرگرمیوں کا بہت کم فائدہ ہم کو مل رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہری عمل تو بہت ہے مگر اسپرٹ موجود نہیں۔ مثال کے طور پر لوگوں میں جلن کا جذبہ بہت بڑے پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے کام کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر ایک کو اپنا کام زیادہ نظر آتا ہے اور دوسرے کا کام کم۔ اس مزاج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر لوگوں کے اندر جلن کے بجائے خیر خواہی بے اعترافی کے بجائے اعتراف کا مزاج پیدا ہو جائے تو موجودہ سرگرمیوں سے ہم کو چوگنا فائدہ ملنے لگے گا۔

البجرہ اسکول (Hob Moor Road) میں ۳ اکتوبر کی سہ پہر کو خطاب کا پروگرام تھا۔ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں آگئے تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری قومیں اسلام کے خلاف سازش کر رہی ہیں۔ مگر میرے نزدیک اسلام کا زیادہ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہین طبقہ اسلامی جدوجہد میں شریک نہیں۔ برطانیہ میں ایک ہزار مسجدیں اور اسلامی مرکز ہیں۔ مگر ان مسجدوں اور اسلامی اداروں سے زیادہ تر غیر ذہین طبقہ وابستہ ہے۔ ذہین طبقہ اس سے دور ہے۔

میں نے کہا کہ چند سال پہلے میں بار بیڈوز گیا۔ وہاں میری ایک تقریر تھی۔ ایک آدمی اپنے پندرہ سال کے لڑکے کو پکڑ دھکڑ کر لے آیا۔ وہ آیا تو حاضرین کے ساتھ نہیں بیٹھا بلکہ کنارے اپنا رخ الٹی طرف کر کے بیٹھ گیا۔ کسی نے پوچھا کہ تم اس طرح الگ تھلگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ اس نے کہا کہ می ناٹ (me not) یہی اس طبقہ کے بیشتر لوگوں کا حال ہے۔ وہ می ناٹ کلاس بنے ہوئے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو اب تک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے قابل فہم (understandable) نہ بنا سکے۔ روایتی انداز کی تقریریں اور مضامین اس طبقہ کو اسلام کی طرف نہیں لا سکتے۔ آج اسلام کی ری ڈسکوری کی ضرورت ہے۔ اسلام قدیم ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے کی طاقت رکھتا تھا اور آج کے ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر آج ایسے داعیوں کی ضرورت ہے جنھوں نے اسلام کو ری ڈسکور کیا ہو۔ اس سلسلہ میں میں نے کئی مثالیں دے کر اس معاملہ کو واضح کیا۔

برطانیہ میں جو مسلمان آباد ہیں ان میں شاید ہی آپ کو کوئی ایسا آدمی ملے جو سکون کی نیند سوتا ہو اور جس کو مسرت کی زندگی حاصل ہو۔ یہاں کی پوری زندگی سودی قرضوں پر قائم ہے۔ گھر، کار اور تمام قیمتی چیزیں قرضوں سے حاصل کی جاتی ہیں اور ساری زندگی آدمی کما کما کر ان کا قرض مع سود ادا کرتا رہتا ہے۔ دوسری طرف گورنمنٹ ٹیکسوں میں عام آدمی کی کمائی کا ۳۰ فیصد اور زیادہ کمائی والوں کا ۶۰ فیصد وصول کر لیتی ہے۔ انڈیا اور پاکستان کی طرح یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ رشوت یا غلط حساب کے ذریعہ آدمی ٹیکس سے بچ جائے۔ یہاں کا نظام ایسا ہے کہ ہر آدمی کو بہر حال ٹیکس کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح تمام لوگ ایک قسم کے اقتصادی ٹریپ (trap) میں پھنس کر زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا بہت بڑا مسئلہ اولاد کا ہے۔ یہاں کی سوسائٹی کا سب سے بڑا مسئلہ آزادی ہے۔ مطلق آزادی کو یہاں سب سے بڑی انسانی قدر سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی، اسکول اور پورے سماج سے وہ آزادی کا سبق حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ماں باپ کے لئے آزاد مخلوق بن جاتا ہے۔ ماں باپ اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہیں تو وہ فوراً جواب دے گا کہ تم اپنا کام کرو، تم

سے اس کا کوئی تعلق نہیں :

Mind your own business.
Its nothing to do with you.

ماں باپ اس طرح کے جواب سنتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ بچہ کے ساتھ سختی کریں تو بچہ کے ایک ٹیلیفون پر پولیس آئے گی اور ماں باپ کو پکڑ لے جائے گی۔

۱۹ اگست کی صبح کو ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے نکلے۔ سڑک پر آئے تو پہلا منظر یہ دکھائی دیا کہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ایک بھیڑیا نما کتے کو اپنے ساتھ لئے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہا ہے۔ مغربی ملکوں میں کتا زندگی کا جزء بن گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ آدمی جس طرح ایک بھیڑیا نما کتے کو لے کر بے خوف چلا جا رہا ہے۔ کیا اسی طرح وہ کسی بھیڑیے کو لے کر بھی چل سکتا ہے۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ اس کی وجہ دونوں کی فطرت کا فرق ہے۔ کتے کو خدا نے اپنے مالک کے لئے وفادار بنایا ہے جب کہ بھیڑیا صرف ایک خوں خوار جانور ہے۔ وہ ایک عام انسان کے لئے خونخوار ہے اور مالک کے لئے بھی غیر وفادار۔

اس دنیا میں بھیڑیا بھی ایک قابل پیشین گوئی کردار کا حامل ہے اور کتا بھی قابل پیشین گوئی کردار کا حامل۔

المرکز الاسلامی کے نام سے یہاں ایک سنٹر ہے جس کو عربوں نے قائم کیا ہے۔ ۱۹ اگست کو اسے دیکھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ ۱۹ اگست کو یہاں دو رکعت نماز ادا کی اور حسب توفیق دعائیں کیں۔ یہ مسجد ایک ہشت پہل ہال میں بنائی گئی ہے۔ جمعہ کے نمبر کی جگہ لکڑی کی ایک چھوٹی سی کرسی رکھی ہوئی ہے۔ پوری مسجد میں قالین کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس مسجد کا نام مسجد الرحمٰن ہے۔ پورے اٹلی میں غالباً صرف دو مسجد ہے۔ ایک میلان کی موجودہ مسجد اور دوسرے روم کی مسجد جو حال میں تعمیر ہوئی ہے۔ اٹلی میں یہ سارا کام عربوں کے تعاون سے ہو رہا ہے۔

اس مسجد سے متصل ایک مرکز ہے۔ یہاں مسلم مرد اور مسلم عورتیں کثرت سے موجود تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج اطالوی مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ اس قسم کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ مرکز کے ڈائرکٹر السید عبد الفتاح

مجھ کو جانتے تھے اور میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ وہ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے دوپہر کے اجتماعی کھانے میں شریک کیا۔ اور اصرار کیا کہ اجتماع سے خطاب کروں۔ وقت بہت کم تھا کیوں کہ مجھ کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں بیٹھنا تھا۔ میں نے اسی وقت بیٹھ کر ایک فل اسکیپ کاغذ پر ایک عربی تقریر لکھی اس کے بعد اسٹیج پر آیا۔ ابتداءً کچھ کلمات انگریزی میں کہے اس کے بعد عربی میں لکھی ہوئی تقریر پیش کی۔ ایک عرب عالم نے فوری طور پر اس کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا۔

ایک ایشیائی نے اہل مغرب کے تعصب کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کا میڈیا ویسٹرن فریم ورک کے سوا کسی اور ڈھنگ پر کسی بات کو بتانا جانتا ہی نہیں:

There is a lot of reluctance in the media to explain anything outside the western framework.

میں نے کہا کہ ایشیائی ملکوں میں کونسا ملک ہے جہاں یہ مزاج موجود نہیں ہے۔ ہندستان والے ہندستانی نقطۂ نظر سے ہر چیز کو بیان کرتے ہیں۔ پاکستان والے پاکستانی نقطۂ نظر سے ہر معاملے کی تشریح کرتے ہیں۔ یہی تمام قوموں کا حال ہے۔ پھر اس کے لئے آپ اہل مغرب کی شکایت کیوں کر رہے ہیں۔

میرے ٹکٹ کا جو ریزرویشن تھا، اس میں اٹلی، انگلینڈ اور مالٹا شامل تھے۔ مگر درمیان سفر میں بعض وجوہ سے میلان میں مالٹا کو حذف کر کے مجھ کو نیا ٹکٹ بنوانا پڑا۔ اس طرح سفر مزید جاری نہ رہ سکا۔

"مالٹا" کا لفظ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک تاریخی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی باقاعدہ جدوجہد کو اگر سلطان ٹیپو سے مانا جائے تو وہ ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی جبکہ سلطان انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس کے بعد مسلسل یہ جنگ مسلح ٹکراؤ کی صورت میں جاری رہی۔ مولانا محمود حسن دیوبندی اس ناکام شمشیری جنگ کی آخری کڑی تھے۔ اسی کے جرم میں ان کو تقریباً ساڑھے تین سال تک مالٹا کے قلعہ میں قید کی زندگی گزارنا پڑا۔

مالٹا سے رہا ہو کر وہ ۸ جون ۱۹۲۰ کو دوبارہ بمبئی کے ساحل پر اترے۔ اس وقت مہاتما گاندھی ہندستان کی سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے جدوجہد آزادی کے طریق کار میں انقلابی تبدیلی پیدا کر کے اس کو تشدد کے بجائے عدم تشدد کے اصول پر قائم کر دیا تھا۔

اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے اس تبدیلی کو قبول کر لیا۔ مولانا محمود حسن دیوبندی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے تمام لوگوں نے مہاتما گاندھی کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح سو اسو سال کی ناکام قربانیوں کے بعد آزادی کی تحریک پر تشدد اصول کو ترک کر کے عدم تشدد کے اصول پر چلنے لگی اور آخر کار ۱۹۴۷ میں کامیابی کے مرحلہ تک پہنچی۔

اسی قسم کا معاملہ آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں وہ اکثریتی فرقہ کے تعصب اور زیادتی کا شکار ہو رہے ہیں۔ مسلم لیڈروں نے دوبارہ لفظی جنگ کی صورت میں ایک جوابی تحریک شروع کر دی۔ یہ مطالبہ، احتجاج، عوامی مظاہرہ کے اصول پر چلائی گئی۔ یہ پر شور جنگ پچاس سالہ قربانیوں کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہو گئی ہے۔ اس سے مسلمانوں کے نقصان میں اضافہ تو ہوا مگر اس سے مسلمانوں کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

اب دوبارہ مسلم سیاست میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اپنی جدوجہد کو اصولِ احتجاج کے بجائے اصولِ تعمیر پر قائم کریں۔ اب وہ خارجی مطالبہ کے بجائے داخلی تعمیر پر محنت کریں۔ وہ مبنی بر غیر سیاست کو چھوڑ کر مبنی بر خویش سیاست کو اختیار کر لیں۔ لیبیا کے ایک صاحب کو میں نے گرمی لال جین کا یہ اقتباس دکھایا:

اب ہمارے لئے کیا راستہ ہے۔ کیا ہم اپنی پرانی دنیا کی طرف واپس چلے جائیں، مانوس فراریت کی دنیا کی طرف یا ہم کٹرپن سے ٹکراؤ کی طرف بڑھیں۔ یہ پہلا انتخاب نہیں جس کی ایک شخص تمنا کر سکتا ہے۔ اور تیسرا انتخاب افق پر موجود نہیں۔ الا یہ کہ مایوسی کے عالم میں ہم یہ خیال کریں کہ آئندہ کبھی قذافی کی ہوا نکل جائے اور لیبیا دنیا میں ایک نئے آغاز کا نقیب بن جائے:

Where then do we go from here? Back into our old, familiar escapism, or forward into confrontation with obscurantism. It is not a choice I for one would wish to make. And a third option is not on the horizon unless in our desperation we regard the deflation of Col Gaddafy in far away Libya as a harbinger of a new beginning in the world.
Girilal Jain, *The Times of India*, May 7, 1992, p. 8.

ایک مجلس میں میں نے یہ حدیث سنائی کہ من صمت نجا (جو آدمی چپ رہا اس نے نجات پائی) لوگ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کسی کا قول ہے کہ جب میں چپ ہوتا ہوں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں اور جب میں بولتا ہوں تو میں نہیں سوچتا:

While I am quiet I think,
while I talk, I do not.

سوچنا گویا بولنے کی تمہید ہے۔ سوچنا گویا بولنے کی تیاری ہے۔ اگر آپ نے سوچنے کا مرحلہ طے کیا ہے تو آپ نے اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کی ہے کہ آپ بولیں۔ سوچنا آپ کو بتاتا ہے کہ آپ کیا بولیں اور کس طرح بولیں۔ اگر آپ نہ سوچیں تو آپ یہ بھی نہیں جانیں گے کہ مسئلہ کیا ہے۔ اور جو آدمی مسئلہ کی حقیقت ہی سے واقف نہ ہو وہ بولنے کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے۔

بولنا آسان ہے مگر سوچنا بے حد مشکل ہے۔ بولنا جلد بازی کا عمل ہے اور سوچنا صبر کا عمل۔ ایک غیر سنجیدہ آدمی بھی بولنے کا کام کر سکتا ہے۔ مگر سوچنے کا کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو سنجیدہ ہوں۔

رومن کیتھولک چرچ میں اب تک یہ قاعدہ تھا کہ پادری کے لئے مجرد رہنا ضروری تھا۔ مگر ایسے اسکینڈل کی تعداد بڑھنے لگی جب کہ پادریوں نے عورتوں سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کر لئے۔ چرچ کے ذمہ دار اس کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۹۲ میں ویٹکن کے پوپ جان پال دوم نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں پادریوں کو نکاح کی اجازت دیدی گئی ہے۔

روم میں میں نے ایک پادری سے یہ بات کہی۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں، مگر پوپ نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر شادی شدہ رہ کر ایک پادری زیادہ اچھی طرح اپنی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ پادری کی ذمہ داری مجرد رہ کر زیادہ بہتر طور پر ادا کی جا سکتی ہے:

But Pope has also added that being single is more suited to carrying out a priest's duties. The needs of the Priesthood are better served by celibacy.

اس سفر میں کئی ایسے تجربے ہوئے جن کے درمیان محسوس ہوا کہ یورپ میں عربوں کے ساتھ آج وی آئی پی جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۲ میں ترکی وغیرہ کا سفر کیا۔ اس سفر کی مفصل روداد "سفرنامہ روم و مصر و شام" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ بحری سفر کے ذریعہ وہ ۲۳ مئی ۱۸۹۲ کو قسطنطنیہ پہنچے اور وہاں تین مہینہ قیام کیا۔ ایک روز قسطنطنیہ کے مکتب حربیہ کے سکریٹری ذکی پاشا سے ملنے گئے۔ موصوف پہلے سے مولانا شبلی سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ بوقت ملاقات ایک عجیب واقعہ گزرا جو مولانا شبلی کے الفاظ میں یہ تھا:

اتفاق سے ذکی پاشا باہر جا چکے تھے۔ آدمی نے کہا کہ ذرا ٹھیر جائیے، شاید جلد آجائیں۔ اسی اثنا میں وہ آپہنچے۔ گاڑی سے اترنے کے ساتھ انھوں نے ہماری طرف رخ کیا۔ شیخ علی طلیان اور میں دونوں عربی لباس میں تھے۔ اگرچہ میرے سر پر ریشمی عمامہ اور کمر میں سنہری پیٹی تھی لیکن قفطان اور عبا کی وجہ سے مجموعی صورت سے میں عرب معلوم ہوتا تھا۔ ذکی پاشا کو اس وقت نہایت جلدی تھی۔ سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیان (ترکی سکہ) نکالیں۔ پہلے تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ پھر خیال آیا کہ نعوذ باللہ، انھوں نے ہم کو عام عربوں کی طرح گداگر سمجھا۔ اس خیال کے ساتھ مجھ کو نہایت رنج اور رنج کے ساتھ غصہ آیا۔ میں نے چلا کر کہا: ما جئنا لهذا، لسنا من الفقراء (ہم اس لئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں) پاشا موصوف اگرچہ عربی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چہرے کی ہیئت اور لہجۂ کلام سے سمجھے کہ یہ امر اس کو ناگوار گزرا۔ شیخ علی طلیان کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ غیظ میں کیوں ہیں۔ شیخ علی طلیان ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتے تھے۔ میرے آنے کی غرض بیان کی۔ پاشا موصوف نہایت شرمندہ ہوئے۔ صفحہ ۴۴-۴۵)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو سال پہلے عربوں کی عام تصویر کیا تھی۔ غالباً ۱۹۴۱ کی بات ہے، اعظم گڈھ میں خود میرے یہاں اسی قسم کے ایک "عرب مسافر" آئے تھے اور ان کو میں نے ایک رات اور ایک دن اپنے مکان پر ٹھہرایا تھا۔ اور ان کی خدمت کی تھی۔ صبح کو جب میں ان کے کمرہ میں گیا اور پوچھا کہ رات کیسی گزری تو انھوں نے کہا: ما کان النوم معنا باللیل۔ معلوم ہوا کہ مچھر کی وجہ سے وہ رات کو ٹھیک سے نہ سو سکے۔

مگر آج عربوں کی تصویر اس سے سراسر مختلف ہے۔ "عرب شیخ" کا لفظ اب دولت کا نشان بن چکا ہے اور اسی کے ساتھ عزت و احترام کا بھی۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو واپسی ہوئی۔ صبح کو فجر سے کچھ پہلے برمنگھم سے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ ہم کو لندن سے دہلی کے لئے جہاز لینا تھا۔ برمنگھم سے جناب شمشاد خاں صاحب کے ساتھ بذریعہ روڈ سفر کیا۔ راستہ میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔ آگے فلاں سڑک پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تاحد نظر کاریں کھڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ شمشاد خاں صاحب نے فوراً اپنی گاڑی موڑی اور نئے راستہ پر سفر کرتے ہوئے ایرپورٹ پہنچے

لندن ایرپورٹ پر جناب شمشاد خاں صاحب سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایرانڈیا کی فلائٹ ۴ گھنٹہ لیٹ ہے۔ ہم کو ایرپورٹ پر مزید انتظار کرنا ہوگا۔ پھر مجھے ترکی کے صدر کا قصہ یاد آیا۔ وہ امپورٹڈ کار میں بیٹھ کر گھر سے دفتر کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ کار میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی تو ہم نے باہر سے خرید کر حاصل کر لی مگر پٹرول ڈالنا ہمارا کام تھا اور یہاں ہم فیل ہو گئے۔ یہی حال ایرانڈیا کا ہے۔ جہاز تو ہم نے باہر سے خرید کر منگا لئے۔ مگر اس کو صحیح طور پر چلانے کے لئے ہمیں اپنا حصہ ادا کرنا تھا۔ یہاں ہم فیل ہو گئے۔

لندن ایرپورٹ کی انتظار گاہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دیوار پر لگے ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ برٹش ایرویز کے چیف ایگزیکٹو سر جان ایگن کی دستخط سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے اپنے ایرپورٹ کی سروس پر ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک آپ مطمئن نہ ہوں:

"We won't be satisfied with the service at our airports until you are."

Sir John Egan
Chief Executive
BAA plc.

بہتر کارکردگی کا یہی واحد معیار ہے۔

لندن سے ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۱۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ جہاز پورے پانچ گھنٹہ لیٹ تھا۔ لندن سے دہلی کی دوری ۷۵۳۰ کیلو میٹر ہے۔ یہ بڑا جہاز تھا۔ مگر اس کی تقریباً آدھی سیٹیں خالی تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایئر انڈیا کی سروس بہت بدنام ہوگئی ہے۔ اس کا ایک تجربہ مجھ کو آج کے سفر میں ہوا۔ لندن کے مقررہ وقت سے یہ جہاز پانچ گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوا۔

جہاز جب فضا میں بلند ہو کر دلی کی طرف روانہ ہوا تو خیال آیا کہ میں دہلی۔ لندن۔ دہلی کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنی آخری منزل کی طرف جا رہا ہوں۔

پرواز کے دوران ایک مسافر کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جہاز کے عملہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافروں میں اگر کوئی ڈاکٹر ہو تو وہ فوری مقام پر آجائیں۔ ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ فوراً تین آدمی اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہاں پہنچ گئے۔

۵ اکتوبر کو صبح چار بجے ہمارا جہاز دہلی ایئرپورٹ پر اترگیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کیوں کہ یہ میرے لئے غیر معمولی طور پر لمبا سفر تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ اپنی دنیا میں دوبارہ واپسی ایک موہوم سی چیز نظر آتی تھی۔

لندن کے مضافات سے تعلق رکھنے والی زیادہ عمر کی ایک برٹش خاتون جلین رائٹ (Ms Gillian Wright) نے بتایا کہ پچاس سال پہلے برٹش سوسائٹی آج سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ اس وقت ہم اپنے گھروں میں تالا نہیں لگاتے تھے۔ سماجی تشدد کا نام ونشان نہیں تھا۔ جوان لڑکیاں رات کو ادھر سے ادھر جاتی تھیں مگر انھیں اس کا ڈر نہیں ہوتا تھا کہ کوئی انھیں چھیڑے گا۔ آج یہ سب ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ آج ہی رات کو کچھ لڑکوں نے میرے گھر پر پتھر پھینکے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے یہ

بدیہی ہماری سوسائٹی میں آئی ہے۔

قدیم زمانہ میں جنگ شہروں سے باہر میدان جنگ میں صرف دو فوجوں کے درمیان ہوتی تھی۔ آج لڑائی ہوتی ہے تو پوری کی پوری آبادی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو عمومی ہنگامی حالت پیدا ہوتی ہے اس سے ساری روایتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں اکثر ملکوں میں پیش آیا۔ جنگوں کے دوران ہر قسم کی کارروائی کرنی پڑی۔ اس سے قدیم اخلاقی روایتیں ٹوٹ گئیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر جگہ جہاد کے نام پر لڑائی کا مزاج بنا ہوا ہے۔ ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں لڑائی جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر قسم کی اخلاقی اور انسانی روایتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ یہ لڑائیاں بالفرض فتح پر ختم ہوں تب بھی ان کا یہ نقصان یقینی ہے کہ اس کے بعد ہر جگہ ایک ایسا انسانی معاشرہ بنے گا جو تمام اعلیٰ روایتوں سے خالی ہوگا۔ یہاں تک کہ لوگ چیخ اٹھیں گے کہ اس اسلامی نظام سے تو قدیم غیر اسلامی نظام ہی اچھا تھا۔

سفر سے واپسی کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو میں نے جناب شمشاد محمد خاں صاحب (برمنگھم) کے نام ایک خط روانہ کیا تھا۔ اس میں سفر کے کئی تجربات درج تھے۔ یہ خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

برمنگھم میں جو دن آپ لوگوں کے ساتھ گزرے وہ میری زندگی کے یادگار دن تھے۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی کسی شخص سے ملا اور اس نے اس سے کچھ نہیں چکھا تو گویا وہ مردہ سے ملا۔ اس حدیث کے مطابق، آپ سے میری ملاقات ایک زندہ شخص سے ملاقات تھی۔ یقیناً میں نے آپ سے بہت سی باتیں جانیں، آپ سے بہت سی نئی نئی باتیں سیکھیں۔

ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے اب میری عمر ۱۷ سال ہو چکی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوبارہ آپ سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔ بہر حال اگر دنیا میں دوبارہ ملاقات مقدر نہ ہو تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت میں جنت میں یکجا کر دے۔ اور وہاں ملاقات کا موقع نصیب فرمائے کیونکہ جنت کی ملاقات ہی اصل ملاقات ہے۔

لندن ایئرپورٹ پر آپ سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایئر انڈیا کی فلائٹ پانچ گھنٹہ لیٹ ہے۔ یہ سارا وقت ایئرپورٹ پر انتظار میں گزارنا پڑا۔ میں نے سوچا

کہ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو ہر منگم میں آپ حضرات کے ساتھ مزید کچھ وقت گزار سکتا تھا۔ مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ کہہ دو کہ اگر میں غیب کو جانتا تو بہت نفع حاصل کرتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی (الاعراف ۱۸۸)

یہ آیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں سوء سے بچنے اور خیر کو پانے کا تعلق تمام تر مستقبل بینی سے ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ جو شخص پیغمبر کی پیشگی خبر پر یقین کرکے اخروی مستقبل کو اپنا concern بنائے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے وہی زندگی کے طویل تر مرحلہ میں کامیاب رہے گا۔

لندن ایئرپورٹ پر میں انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا، دیکھا تو لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر بے فکری کے آثار تھے، میں نے سوچا کہ ان کی اس بے فکری کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی جیب میں پونڈ اور ڈالر موجود ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے وہ دنیا کی ہر وہ چیز حاصل کرسکتا ہے جس کو وہ چاہے۔

کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ عنقریب وہ ایک اور دنیا میں داخل کردیے جائیں گے جہاں پونڈ اور ڈالر کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی۔ وہاں کا سکہ بالکل دوسرا ہوگا۔ اور جس آدمی کے پاس وہاں کا سکہ نہ ہو وہ وہاں بالکل مفلس ہوکر رہ جائے گا۔ خواہ دنیا میں اس کا بینک بیلنس کتنا ہی زیادہ ہو۔

جہاز فضا میں اڑکر لندن سے دہلی کی طرف روانہ ہوا تو خیال آیا کہ میرے پاس دہلی۔ لندن کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس کے مطابق اپنا سفر پورا کرکے میں اپنے وطن واپس جارہا ہوں۔ اسی طرح میرے پاس اور تمام انسانوں کے پاس ایک اور ریٹرن ٹکٹ ہے۔ یہ ریٹرن ٹکٹ آخرت۔ دنیا آخرت کے سفر کے لئے ہے۔ اس دوسرے ریٹرن ٹکٹ سے آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آیا۔ اور پھر دوبارہ وہ آخرت کی طرف لوٹ جائے گا۔ جس طرح میرے لئے دہلی کی طرف واپسی کی تاریخ مقرر تھی اسی طرح میری اور تمام انسانوں کی آخرت کی طرف واپسی کی تاریخ بھی مقرر ہے۔ جس دن یہ تاریخ آئے گی تو قرآن کے الفاظ میں، لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہوں گے اور نہ ایک گھڑی آگے (یونس ۴۹)

جہاز ابھی درمیان میں تھا کہ وہ صورت پیش آئی جس کو ہوا بازی کی اصطلاح میں updraft, downdraft کہا جاتا ہے۔ جہاز تیزی سے نیچے اور اوپر ہونے لگا۔ دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، خیریت کے ساتھ مجھ کو دہلی پہنچا۔ دنیا سے لے کر آخرت تک خیریت کا معاملہ فرما۔ ہر مرحلہ میں اور ہر پہلو سے میری مدد فرما۔

جہاز کے کیپٹن نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز ۵۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دہلی کی طرف جا رہا ہے۔ اس کو سن کر خیال آیا کہ عین اسی وقت ہر مسافر ایک اور سفر طے کر رہا ہے۔ یہ آخرت کا سفر ہے۔ زمین مزید تیزی کے ساتھ ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی علامتی طور پر بتا رہی ہے کہ آخرت کا سفر اس سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔

میں نے سوچا کہ جس طرح جہاز کا کیپٹن اعلان کر کے لوگوں کو سفر دنیا کی حقیقت سے باخبر کر رہا ہے، کاش اسی طرح تمام انسانوں کو سفر آخرت کے بارے میں بتایا جا سکے۔ کاش ایسا ہو کہ اس دنیا کا کوئی کان نہ ہو جس نے اس اعلان کو نہیں سنا، اور کوئی آنکھ نہ ہو جس نے اس خبر کو نہیں پڑھا۔ پھر خیال آیا کہ لندن ایئرپورٹ کی ایک دیوار پر میں نے برٹش ایئرویز کے ایگزیکٹیو Sir John Egan کے دستخط سے ایک بورڈ پر یہ الفاظ پڑھے تھے:

We won't be satisfied with the service at our airport until you are.

میں نے سوچا کہ دعوت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ دعوت صرف اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ مدعو اس بات کا اعتراف کر لے کہ مجھے پیغام پوری طرح پہنچا دیا گیا۔ دعوت کی تکمیل داعی کے دعویٰ کی بات نہیں ہے بلکہ مدعو کے اقرار کی بات ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ اور تاکہ لوگ کہہ دیں کہ تم نے پڑھ دیا (الانعام ۱۰۵)

راستہ میں لندن کے اخبار ڈیلی میل (۴ اکتوبر ۱۹۹۳) میں ایک سبق آموز رپورٹ پڑھی۔ اس کا عنوان تھا: (height of inhumanity) رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک برطانی خاتون کے بچہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت کچھ بڑا تھا، اس لئے اس کو بچوں کے خوبصورت قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس کا سات سالہ بچہ بڑوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ یہ اگرچہ قانون کے مطابق تھا۔ مگر خاتون کو اس کا نہایت سخت صدمہ ہوا:

In death, as in his short life, Barrie Lockwood has been set apart from other children. His family were denied permission to bury the seven-year-old victim of cerebral palsy alongside other youngsters because his coffin was six inches too long. Officials of Harrogate council in North Yorkshire refused to bend the rules, which state that 4ft is the maximum for burial in the children's section of Ripon cemetery. Instead he was laid to rest 200 yards away among adult graves up to 100 years old, his teddy bear-shaped headstone surrounded by more formal monuments. At the time, in January, Barrie's mother Valeri, of Aismunder by Close, Ripon, was too distraught to argue following his death from a chest infection. But now she is campaigning on behalf of other bereaved parents for a change in the regulations. 'In times of great distress it can be a consolation to know your child rests with others of his generation, but my son has been denied even that,' she said. 'Because of his condition, his life didn't involve much contact with other children, so surely it wasn't asking too much to be buried next to those whose lives were also cut short? 'The children's cemetery is so pretty, as much more appropriate for a boy of seven than placing him among adults' graves dating back generations..(John Woodcock)

اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک ماں کو یہ پسند نہیں کہ اس کا بچہ مرنے کے بعد ایک غیر pretty قبرستان میں دفن ہو۔ مگر عین اسی وقت بے شمار مائیں اس پر راضی ہیں کہ ان کا محبوب بچہ مرنے کے بعد آگ میں جلے اور جہنم کا گڑھا اس کا ابدی ٹھکانا ہو۔ شاید ہماری دنیا میں اس سے زیادہ عجیب تضاد کی کوئی اور مثال نہیں ملے گی۔

طویل سفر کے دوران کئی بار تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے نیند آئی۔ ایک بار جھپکی کے ساتھ نیند آئی تو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں فضا کی بلندی میں سفر کر رہا ہوں۔ مگر یہ سفر ہوائی جہاز میں نہیں ہو رہا ہے بلکہ آپ کے ساتھ موٹر کار میں ہو رہا ہے۔ آپ اپنی کار چلا رہے ہیں۔ آپ کے پاس سامنے کی سیٹ پر ثانی اثنین ہیں۔ اور میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کار ہم کو لئے ہوئے ہوائی جہاز جیسی تیزی کے ساتھ فضا میں اڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

اس قسم کے مختلف احساسات کو لئے ہوئے میرا سفر جاری تھا۔ یہاں تک کہ ۵ اکتوبر کی صبح کو ۴ بجے ہمارا جہاز دہلی ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ شکر ادا کیا کہ اس نے میری دعا قبول کر لی۔ وہ خیریت کے ساتھ مجھے دہلی سے لے گیا اور خیریت کے ساتھ دوبارہ دہلی

پہنچا دیا۔

دہلی ایئرپورٹ پر کسٹم کی جانچ بہت سخت ہوتی ہے۔ میں نے ایک ٹرالی پر اپنا بیگ اور کتابوں کا ایک بنڈل رکھا اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں تک کہ میں وہاں پہنچا جہاں راستہ کے دونوں طرف کسٹم کا عملہ تیز نگاہوں کے ساتھ ہر مسافر کو دیکھنے کے لئے موجود رہتا ہے۔ یہاں میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں کسٹم کا ایک کارندہ میری طرف بڑھا، اس نے روکھے انداز سے سوال کیا کہ یہ کیا چیز ہے بنڈل میں۔ میں ابھی کچھ بولا نہیں تھا کہ قریب کھڑے ہوئے افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: جاؤ بابا، تم جاؤ۔

میں نے کہا کہ خدا یاد، آخرت میں بھی میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرما۔ حشر کے میدان میں جب میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ نظریں جھکائے ہوئے آگے کی طرف بڑھوں اور روکنے والے مجھے روکنے کے لئے میری طرف متوجہ ہوں تو تیری طرف سے آواز آئے: میرے اس بندے کو جانے دو، اس کو جانچ کے لئے مت روکو۔

باہر نکلا تو ہمارے انتظار میں ایک صاحب وہاں موجود تھے۔ کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ آسانی کے ساتھ ایئرپورٹ سے روانہ ہو کر گھر آ گیا۔ دوبارہ دل سے دعا نکلی کہ کاش اللہ کی رحمت سے ایسا ہو کہ جب میری زندگی کے جہاز کی واپسی کا وقت آئے اور وہ دنیا سے روانہ ہو کر آخرت کی زمین پر اتر جائے تو وہاں خدا کے فرشتے میری رہنمائی کے لئے موجود ہوں۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ یہاں تک کہ مجھے جنت کے اندر پہنچا دیں۔ بے شک اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ اپنے عاجز بندہ کے ساتھ اس قسم کا رحمت کا معاملہ فرمائے۔ میری یہی دعا اپنے لئے بھی ہے اور یہی دعا آپ لوگوں کے لئے بھی۔

یورپ کے اس طویل سفر میں مجھے بار بار جدید تمدن کے پر رونق مناظر دیکھنے کو ملے۔ ان کو دیکھ کر مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آتی تھی کہ اللہ آئندہ تم کو آخرت کی نشانیاں دکھائے گا تو تم اس کو پہچان لوگے (۹۳ : ۲۷) میں نے سوچا کہ صنعتی تمدن کی یہ رونقیں ایک اعتبار سے جنت کا تصویری تعارف ہیں۔ یہ تصویریں اس لئے تھیں کہ ان کو دیکھ کر انسان جنت کی پہچان حاصل کر لے۔ مگر انسان ان تصویروں ہی کو حقیقت سمجھ کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑا۔

دور اول کے اہل ایمان نے جنت کی تصویریں دیکھے بغیر جنت پر یقین کیا تھا۔ آج کے لوگ جنت کی تصویریں دیکھنے کے باوجود اس پر یقین کرنے میں ناکام ہیں۔ کیسی عجیب تھی پچھلے لوگوں کی کامیابی اور کیسی عجیب ہے موجودہ لوگوں کی نامرادی"۔

وحید الدین

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳

اعلان

الرسالہ کا شمارہ مئی ۱۹۹۶ "دین انسانیت" نمبر ہوگا۔ اس میں اسلام کی اخلاقی اور انسانی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ الرسالہ میں اشاعت کے بعد ان شاء اللہ اس کو علٰحدہ پمفلٹ کی صورت میں بھی "دین انسانیت" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔ یہ مجموعہ مثبت انداز میں اس پروپگنڈے کی تردید ہے کہ اسلام تشدد اور جنگ کا مذہب ہے۔

مینجر الرسالہ

خصوصی اعلان

دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جب کہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔

مینجر ماہنامہ الرسالہ

خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۰۶

۱ سنڈے میگزین کے نمائندہ مسٹر این وی سبرامنیم نے ۲۵ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کی سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے انڈیا میں زبردست سیاسی رول ادا کرنے کا موقع ہے۔ مگر سیاسی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک وہ ملک میں اپنا یہ کردار ادا نہ کر سکے۔

۲ نیٹ ورک کلچرس ایشیا کی طرف سے بنگلور میں ۲۷ - ۳۰ نومبر ۱۹۹۵ کو ایک ورکشاپ منعقد ہوئی۔ اس کا عنوان تھا:

Creating harmony amidst cultural conflict

صدر اسلامی مرکز کے نام اس کا دعوت نامہ آیا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے ایک ورکنگ پیپر بھی تیار کر لیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے سفر ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ تیار شدہ پیپر کی ایک کاپی منتظمین کے پاس بھیج دی گئی۔

۳ ۲۹ نومبر ۱۹۹۵ کو گول ڈاک خانہ (نئی دہلی) شڈیولڈ کاسٹ کرسچین کا ایک آل انڈیا جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور انسانیت اور مساوات کے موضوع پر ایک مختصر تقریر کی۔

۴ پانچ جنیہ کے نمائندہ مسٹر جاوید انور نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملک میں پھیلے ہوئے اسلامی مدارس سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ مدارس ایک نہایت مفید سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس کے تعلیمی نظام کو جدید اصطلاح میں اقدار پر مبنی تعلیم (ویلو بیسڈ ایجوکیشن) کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے تعلیمی نظام کے ذریعہ ملک کو اچھے شہری تیار کر کے دے رہے ہیں۔

۵ میڈیا اسٹار (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر ایم احمد کاظمی نے ۵ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ سیکولرزم کا مستقبل ہندستان میں کیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مشترک سماج میں سیکولرزم ہی واحد مفید اور قابل عمل نظام ہے۔ ایسے سماج میں سیکولر نظام کا قیام عقل کے مطابق بھی ہے اور اسلام کے مطابق بھی۔

۶ جاپان (ٹوکیو یونیورسٹی) کے ریسرچ اسکالر مسٹر متسوہیرو کوندو (Mitsuhiro Kondo) نے ۷ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کے رول سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انھیں بتایا گیا کہ ہندستانی مسلمان تقریباً ایک سو پارلیمنٹری حلقہ میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان میں صحت مند سیاسی شعور ہو تو وہ ملک کے سیاسی نظام کی تشکیل میں نہایت مثبت رول ادا کر سکتے ہیں۔

۷ ہندی روزنامہ دینک جاگرن کے نمائندہ مسٹر رام پرکاش ترپاٹھی نے ۸ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع "نئے حالات میں ہندستان کا بدلتا ہوا کلچر" تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ تمام اصلاحات کے لئے صحیح نقطۂ آغاز صرف ایک ہے، اور وہ تعلیم ہے۔ جب تک ملک میں تعلیم نہیں بڑھے گی کوئی بھی مسئلہ حل ہونے والا نہیں

۸ یونین آف کیتھولک ایسین نیوز کے نمائندہ مسٹر اکرا اینٹوکرا (Akkra Antoakra) نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق سپریم کورٹ آف انڈیا کے تازہ فیصلہ سے تھا جس میں الیکشن میں ہندتوا اور ہندوازم کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ فیصلہ خالص ٹکنکل گراؤنڈ پر دیا گیا ہے، وہ قانون اور دستور کی اسپرٹ کے مطابق نہیں۔

۹ یکساں سول کوڈ (مطبوعہ الرسالہ ستمبر ۱۹۹۵) ہر حلقہ میں غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا۔ بہت سے اخبار اور رسالے نے اس کو شائع کیا۔ پمفلٹ کی صورت میں اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہوا۔ کئی اخباروں نے اس موضوع پر انٹرویو شائع کئے۔ اس کا مدلل انداز خدا کے فضل سے اس حد تک مؤثر ثابت ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے جو لوگ پہلے اس کی پرجوش حمایت کر رہے تھے، حتی کہ اس کو الکشن کا اشو بنانا چاہتے تھے، وہ سب سرد پڑ گئے۔ اس سلسلہ میں کثرت سے لوگوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اگلے صفحہ پر دو خط نقل کیا جا رہا ہے۔

نقل خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

فاضل گرامی ومحب سامی مولانا وحید الدین خاں صاحب وفقہ اللہ لما یحب ویرضیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ "الرسالہ" بابت ستمبر ۱۹۹۵ء چند دن ہوئے ملا۔ اس میں آپ کا فاضلانہ مضمون "یکساں سول کوڈ" مطالعہ میں آیا۔ ہمارے علم میں یہ پہلا فاضلانہ ومبصرانہ مضمون ہے جس میں یونیفارم سول کوڈ کا عالمانہ، مبصرانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور تقابلی مطالعہ، ماہرین فن اور قانون سازوں کے بیانات وتجزیہ کی روشنی میں اس کی سطحیت اور عدم ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ آپ ہماری طرف سے اس پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اگر اس کو الگ رسالہ کی صورت میں شائع کردیں اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو جائے تو بہت مفید ہوگا۔ انگریزی ترجمہ ماہرین قانون اور سپریم کورٹ کے ججوں کو بھیجا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ آپ سنجیدگی سے اس پر غور فرمائیں گے اور عجلت سے کام لیں گے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی قوت فکریہ، وسعت مطالعہ، اور ایسے مسائل کے جائزہ لینے کی صلاحیت اسی طرح کے موضوعات ومقاصد میں صرف ہوں اور ملت وملک دونوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ ہم نے یہ نمبر محفوظ کر لیا ہے۔ وہ ایک مرجع اور ماخذ کی حیثیت سے کام دے گا۔ امید ہے کہ مزاج ہر طرح بعافیت ہوگا۔

والسلام، طالب دعا، ابوالحسن علی ندوی ۲۰ اگست ۱۹۹۵

نقل خط امیر جماعت اسلامی ہند

برادر محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ سے ۱۳ جون کی ملاقات کے بعد میں بھی کچھ ایسا مصروف ہوگیا کہ خواہش کے باوجود ملاقات کر سکا اور نہ ہی فون پر بات ہو سکی۔ معذرت خواہ ہوں۔

"دعوت" اور "زندگی" پابندی سے مل رہے ہوں گے۔ آپ کے نام روانہ کرنے کی اور جاری کردینے کی تاکید کر دی تھی اور درمیان میں معلوم بھی کرتا رہا ہوں تو یہی اطلاع ملی کہ آپ کے نام "دعوت" جاری ہو چکا ہے اور برابر جا رہا ہے۔

میں ۱۱ اگست کو ایران گیا تھا، ۱۹ کو لوٹ آیا۔ ایران کے تاثرات ستمبر کے دعوت میں شائع

ہوئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔ احتیاطاً ۱ستمبر کا شمارہ بھی بھیج رہا ہوں۔ ۳۰ اگست سے آج ۲ ستمبر تک چار قسطوں میں روزنامہ قومی آواز میں آپ کا مضمون یکساں سول کوڈ پر چھپتا رہا ہے۔ الحمدللہ نہایت مدلل، جامع اور مؤثر مضمون ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام تک بالخصوص برادران وطن تک پہنچایا جائے۔ یہ مضمون اگر کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا ہو تو براہ کرم اس کی پانچ دس کاپیاں میرے پاس بھجوا دیں اور اجازت دیں تو ملیالم، تمل، کنڈی تلگو، مراٹھی، بنگالی اور گجراتی زبان میں ترجمہ کروا کر شائع کروا دیں۔ میں نے کل فون بھی کیا تھا، آپ کے مکان سے اطلاع ملی کہ آپ باہر تشریف لے گئے ہیں۔ ۳ ستمبر کو پہنچیں گے۔ آپ جب بھی پہنچ جائیں، براہ کرم فون سے ربط پیدا کریں۔ ہمارا صرف ایک فون کام کر رہا ہے ۶۸۲۰۹۷۵ دونوں خراب چل رہے ہیں۔

مدراس سے جمیل صاحب کا فون آیا تھا۔ فرما رہے تھے کہ انھوں نے آپ کو خط بھی لکھا ہے۔ وہ ستمبر کے آخر میں دہلی آ رہے ہیں۔ آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

والسلام، مخلص، سراج الحسن

۲ ستمبر ۱۹۹۵ء

WORDS OF THE PROPHET MUHAMMAD

By Maulana Wahiduddin Khan

The saying of the Prophet Muhammad have been handed down to posterity through both oral and written traditions, the foundations of which were laid by the Prophet's Companions, some of whom were also his scribes. Eternal in essence, they are of value not only to Muslims, but to humanity at large. The present volume is an anthology compiled from the Hadith, an Islamic source book second only to the Qur'an in religious importance. Although brief, it covers, directly or indirectly, the more important aspects of the Hadith's teachings.

22 x 14.5 cm, 100 pages ISBN 81-85063-72-9 Rs. 75

THE ISLAMIC CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013

Tel: 4611128 Fax 91-11-4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

اردو	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	50/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	70/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	40/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
[illegible]ن اسلام	50/-
[illegible]لزم اور اسلام	70/-
اسلام اور عصر حاضر	50/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	95/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمت مومن	7/-
ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعہ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتاب زندگی	55/-
انوار حکمت	-
اقوال حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	35/-
عقلیات اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-

نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعدد ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

English

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	-
The Teachings of Islam	-
The Good Life	-
The Garden of Paradise	-
The Fire of Hell	-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

آڈیو کیسٹ

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسولؐ	25/-
میدان عمل	25/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333

Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96